اصلاحی خطبات

جلد ۱۶

- وقت بڑی نعمت ہے
- قناعت اختیار کرو
- دوسروں کے لئے پسندیدگی کا معیار
- بدعات حرام کیوں؟
- ہر خبر کی تحقیق ضروری ہے
- اللہ کا حکم بے چون وچرا تسلیم کرو
- گناہ چھوڑ دو، عابد بن جاؤ گے
- اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ
- بڑوں سے آگے مت بڑھو
- ملاقات اور فون کرنے کے آداب
- زبان کو صحیح استعمال کریں
- حق کی بنیاد پر دوسرے کا ساتھ دو

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

١٦

اصلاحی خطبات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب	حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
ضبط و ترتیب	مولانا محمد عبداللہ میمن صاحب
تاریخ اشاعت	۵/اکتوبر ۲۰۰۶ء
مقام	جامع مسجد بیت المکرم، گلشن اقبال، کراچی
باہتمام	ولی اللہ میمن ۴۹۱۶۰۳۳
ناشر	میمن اسلامک پبلشرز
کمپوزنگ	خلیل اللہ فراز (0321-2606274)
قیمت	=/روپے

ملنے کے پتے

- میمن اسلامک پبلشرز، ۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹
- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
- مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
- ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی ۱۴
- کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال، کراچی
- اقبال بک سینٹر، صدر کراچی
- مکتبۃ الاسلام، البی فلورمل، کورنگی، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

الحمد للہ وکفیٰ، وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، امابعد!

اپنے بعض بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل میں احقر کئی سال سے جمعہ کے روز عصر کے بعد جامع مسجد بیت المکرم گلشن اقبال کراچی میں اپنے اور سننے والوں کے فائدے کے لئے کچھ دین کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اس مجلس میں ہر طبقہ خیال کے حضرات اور خواتین شریک ہوتے ہیں، الحمد للہ احقر کو ذاتی طور پر بھی اس کا فائدہ ہوتا ہے اور بفضلہ تعالیٰ سامعین بھی فائدہ محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو ہم سب کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں، آمین

احقر کے معاون خصوصی مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہٗ نے کچھ عرصے سے احقر کے ان بیانات کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے محفوظ کر کے ان کے کیسٹ تیار کرنے اور ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا، جس کے بارے میں دوستوں سے معلوم ہوا کہ بفضلہ تعالیٰ ان سے بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

ان کیسٹوں کی تعداد اب ساڑھے چار سو سے زائد ہو گئی ہے، انہی میں سے کچھ کیسٹوں کی تقاریر مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہٗ نے قلمبند بھی فرمالیں اور ان کو چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شائع کیا، اب وہ ان تقاریر کا ایک مجموعہ

''اصلاحی خطبات'' کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

ان میں سے بعض تقاریر پر احقر نے نظر ثانی بھی کی ہے، اور مولانا موصوف نے ان پر ایک مفید کام یہ بھی کیا ہے کہ تقاریر میں جو احادیث آئی ہیں، ان کی تخریج کر کے ان کے حوالے بھی درج کر دیئے ہیں، اس طرح ان کی افادیت اور بھی بڑھ گئی۔

اس کتاب کے مطالعے کے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ تقریروں کی تلخیص ہے، جو کیسٹوں کی مدد سے تیار کی گئی ہے، لہٰذا اس کا اسلوب تحریری نہیں، بلکہ خطابی ہے۔ اگر کسی مسلمان کو ان باتوں سے فائدہ پہنچے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور اگر کوئی بات غیر محتاط یا غیر مفید ہے، تو وہ یقیناً احقر کی کسی غلطی یا کوتاہی کی وجہ سے ہے، لیکن الحمدللہ ان بیانات کا مقصد تقریر برائے تقریر نہیں، بلکہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اور پھر سامعین کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

نہ بہ حرف ساختہ سرخوشم، نہ بہ نقش بستہ مشوشم

نفسے بیاد بیاد تو می زنم، چہ عبارت و چہ معانیم

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان خطبات کو خود احقر کی اور تمام قارئین کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں، اور یہ ہم سب کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہوں، اللہ تعالیٰ سے مزید دعا ہے کہ وہ ان خطبات کے مرتب اور ناشر کو بھی اس خدمت کا بہترین صلہ عطا فرمائیں، آمین۔

محمد تقی عثمانی

دارالعلوم کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

الحمد للہ "اصلاحی خطبات" کی سولہویں جلد آپ تک پہنچانے کی ہم سعادت حاصل کر رہے ہیں، پندرہویں جلد کی مقبولیت اور افادیت کے بعد مختلف حضرات کی طرف سے سولہویں جلد کو جلد از جلد شائع کرنے کا شدید تقاضا ہوا، اور اب الحمد للہ دن رات کی محنت اور کوشش کے نتیجے میں صرف ایک سال کے عرصے میں یہ جلد تیار ہو کر سامنے آ گئی، اس جلد کی تیاری میں برادر مکرم جناب مولانا عبد اللہ میمن نے اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس کام کے لئے اپنا قیمتی وقت نکالا، اور دن رات انتھک محنت اور کوشش کر کے سولہویں جلد کے لئے مواد تیار کیا، اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عمر میں برکت عطا فرمائے، اور مزید آگے کام جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے، آمین۔

تمام قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو مزید آگے جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے، اور اس کے لئے وسائل اور اسباب میں آسانی پیدا فرمائے، اس کام کو اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

طالب دعا

ولی اللہ میمن

اجمالی فہرست

جلد ۱٦

فہرستِ مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

صحت اور فرصت کی قدر کرلو

عنوان	صفحہ نمبر

وقت بڑی نعمت ہے

عنوان	صفحہ نمبر

نظام الاوقات کی اہمیت

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

گناہ چھوڑ دو، عابد بن جاؤ گے

عنوان	صفحہ نمبر

''قناعت'' اختیار کرو

عنوان	صفحہ نمبر

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

عنوان	صفحہ نمبر

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک

عنوان	صفحہ نمبر

دوسروں کے لئے پسندیدگی کا معیار

عنوان	صفحہ نمبر

چار عظیم صفات

عنوان	صفحہ نمبر

بڑوں سے آگے مت بڑھو

عنوان	صفحہ نمبر

بدعات حرام کیوں؟

عنوان	صفحہ نمبر

آواز بلند نہ کریں

عنوان	صفحہ نمبر

ملاقات اور فون کرنے کے آداب

عنوان	صفحہ نمبر

ہر خبر کی تحقیق کرنا ضروری ہے

عنوان	صفحہ نمبر

زبان کو صحیح استعمال کریں

عنوان	صفحہ نمبر

حق کی بنیاد پر دوسرے کا ساتھ دو

صحت اور فرصت کی قدر کرلو

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم

گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صحت اور فرصت کی قدر کرلو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ۔

(بخاری، کتاب الرقاق، باب ما جاء فی الصحۃ والفراغ، حدیث نمبر ۶۰۴۹)

دل نرم کرنے والی احادیث

بزرگان محترم و برادران عزیز! حدیث کی کتابوں میں ایک مستقل کتاب "کتاب الرقاق" کے نام سے محدثین قائم فرماتے ہیں، اور اس باب میں وہ

احادیث لاتے ہیں جو انسان کے دل میں نرمی اور رقت پیدا کرتی ہیں، اور آخرت کی فکر پیدا کرتی ہیں، دنیا سے بے رغبتی اور زھد پیدا کرتی ہیں، ایسی احادیث کو "رقاق" کہا جاتا ہے، بعض محدثین نے تو اس موضوع کی احادیث پر مستقل کتاب مرتب کر دی ہے، جیسے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الزھد والرقاق" حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الزھد" ہے، حضرت وکیع بن جراح رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الزھد" ہے۔ اس موضوع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی عجیب احادیث ہیں جن کے الفاظ تو مختصر ہیں، لیکن وہ احادیث معنی کے اعتبار سے بڑی جامع ہیں، اگر آدمی ان پر غور کرے تو وہ احادیث انسان کی اصلاح کے لئے بے نظیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان احادیث کو سمجھنے اور ان کی قدر کرنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

یہ بہت اہم حدیث ہے

اس وقت میں نے انہی احادیث میں سے ایک حدیث آپ کے سامنے تلاوت کی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "صحیح البخاری" میں "کتاب الرقاق" کو اسی حدیث سے شروع فرمایا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اسلوب بڑا عجیب وغریب ہے، جب وہ کسی کتاب میں کوئی باب قائم کرتے ہیں، اور پھر اس کے تحت جو حدیث لاتے ہیں، وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوتا ہے، "کتاب الرقاق" میں سب سے پہلے اس حدیث کو لا کر گویا انہوں نے اس بات کا اظہار فرمایا ہے کہ اس موضوع پر جو احادیث ہیں، ان میں یہ حدیث "اصل" کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہ حدیث دوسری احادیث کے لئے "جڑ" اور "بنیاد" ہے، اور واقعۃً اس حدیث میں بڑی عجیب وغریب ہدایت ہے۔

حضرت مفتی صاحب اور حدیث بالا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث بکثرت یاد دلایا کرتے تھے، اور بے شمار مرتبہ اس حدیث پر بیان بھی فرمایا، بلکہ جب آپ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد پہلی مرتبہ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، تو دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور طلباء نے درخواست کی کہ کچھ بیان فرمائیں۔ اس موقع پر آپ نے ان کے سامنے جو بیان فرمایا، اس میں فرمایا کہ آپ حضرات شاید اس انتظار میں ہوں گے کہ میں یہاں کوئی علمی تقریر کروں گا، یا دارالعلوم دیوبند میں کسی پیچیدہ مسئلہ پر بیان کروں گا، لیکن بات یہ ہے کہ یہ علمی گناہ میں پہلے یہاں دارالعلوم دیوبند میں بہت کر چکا ہوں، لہٰذا میں اس کے بجائے کوئی خشک بات کہنا چاہتا ہوں، اور پھر آپ نے یہی حدیث پڑھی اور اس کی تشریح فرمائی۔

حدیث کا ترجمہ

بہر حال اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ" فرمایا کہ اللہ جل شانہ کی دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں لوگ بڑے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ جب یہ نعمت ہمیں حاصل ہے تو اب ہمیشہ ہمارے پاس رہے گی، ایک "صحت" کی نعمت اور دوسرے "فراغت" کی نعمت۔ ان دو نعمتوں کے بارے میں لوگ بکثرت دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

ہر نعمت پر تین حق

انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہر آن ہر لحہ بارش کی طرح برس

رہی ہیں، انسان ان نعمتوں کو شمار بھی نہیں کر سکتا، اور ہر نعمت کا حق یہ ہے کہ اس کی قدر پہچانی جائے، اس پر شکر ادا کیا جائے، اور اس کا صحیح استعمال کیا جائے، ہر نعمت پر یہ تین حق ہیں، اگر انسان ہر نعمت پر یہ تین حقوق ادا کرنے لگے تو اس کا بیڑا پار ہو جائے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ انسان ان کے بارے میں دھوکے میں پڑا ہوا ہے، وہ نعمتیں ہیں، "صحت" اور "فراغت"۔ انسان اس دھوکہ میں پڑا ہوا ہے کہ یہ صحت اس وقت جو مجھے حاصل ہے، وہ رہے گی، آج میں تندرست ہوں تو کل بھی رہوں گا، اور پرسوں بھی رہوں گا، اس دھوکے کے نتیجے میں صحت کے دن گزرتے چلے جاتے ہیں، اور انسان اپنے نیک کاموں کو ٹالتا رہتا ہے، یہی معاملہ "فراغت" کا ہے کہ انسان کو اس وقت فراغت میسر ہے، اور وقت خالی ہے، اب وہ یہ سوچتا ہے کہ میں فارغ ہی رہوں گا، لہٰذا وہ نیک کاموں کو ٹالتا رہتا ہے۔

صحت اور فراغت کی قدر کرلو

یہاں تک کہ وہ "صحت" جس کی بنیاد پر نیک کاموں کو ٹال رہا تھا کہ آج نہیں کل کروں گا، پرسوں کروں گا، وہ صحت ڈھل جاتی ہے، اور انسان پر بیماری آجاتی ہے، اور پھر کام کرنے کا موقع نہیں رہتا۔ فراغت میں بھی کاموں کو ٹالتا رہا ہے کہ ابھی جلدی کیا ہے، کل کرلیں گے، پرسوں کرلیں گے، یہاں تک کہ فراغت ختم ہو جاتی ہے، اور مشغولیت آجاتی ہے، اور پھر وقت نہیں ملتا۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے بندو! صحت کی جو نعمت ہے، اس کی قدر پہچانو، اور اس کو صحیح مصرف میں خرچ کرلو۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ نے فراغت کی نعمت دی ہے، اس کی قدر پہچان لو، اس کو کسی صحیح مصرف پر خرچ کرلو، تو دھوکے سے بچ جاؤ گے۔

ورنہ یہ ہوتا ہے کہ نیک کاموں کو ٹالتے ٹالتے آدمی بیمار پڑ جاتا ہے، اور پھر دنیا سے جانے کا وقت آ جاتا ہے، اس وقت یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اپنی جوانی کی حالت میں اور اپنی صحت کی حالت میں اپنی فراغت کی حالت میں کچھ کام کر لیا ہوتا، اور آخرت کے لئے کوئی پونجی جمع کر لی ہوتی۔

شیطان کے بہکانے کا انداز

دیکھئے! جو آدمی صاحب ایمان ہوتا ہے، اس کو شیطان براہ راست اس طرح نہیں بہکاتا کہ تو بے ایمان ہو جا، یا تو نماز چھوڑ دے، یا روزہ چھوڑ دے۔ ایک صاحب ایمان کو اس طرح نہیں بہکاتا ... کیوں؟ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ صاحب ایمان ہے، اگر اس سے یوں کہا جائے گا کہ تو بے ایمان ہو جا، یا تو نماز چھوڑ دے، یا روزہ چھوڑ دے تو وہ کبھی بھی اس کی یہ بات نہیں مانے گا۔ اس لئے شیطان صاحب ایمان پر دوسرے حربے آزماتا ہے، وہ اس طرح کہ صاحب ایمان نے یہ سنا کہ فلاں نیک کام ہے، اس کو کرنا چاہیے، اب شیطان اس کو بہکاتا ہے کہ ہاں یہ نیک کام ضرور کرنا چاہیے، لیکن جلدی کیا ہے؟ آج ذرا مصروفیت ہے، فلاں فلاں کام کرنے ہیں، کل سے یہ کام شروع کریں گے، جب کل آ جائے گی تو شیطان یہ بہکائے گا کہ آج تو فلاں عذر پیش آ گیا، فلاں کام پیش آ گیا، کل سے شروع کریں گے، کل کل کرتے اس نیک کام کو ٹالتا جائے گا، اور وہ کل کبھی نہیں آئے گی۔ یہ ہے شیطان کا حربہ جو صاحب ایمان پر آزماتا ہے۔

نوافل اللہ کی محبت کا حق ہیں

دل میں یہ خیال اور فکر تو ہے کہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کیا جائے، جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری ہو، اور نیکیوں کا حساب و کتاب ہو تو ہماری نیکیوں کا پلہ

جھک جائے، یہ خیال اور فکر تو ہے، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو اس وقت ٹالنے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، مثلاً یہ تو معلوم ہے کہ جس طرح فرائض و واجبات اللہ تعالیٰ کی عظمت کا حق ہیں، اسی طرح نوافل بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق ہیں، اس لئے بندہ کچھ نوافل بھی ادا کرے، کچھ ذکر کرے، تسبیحات پڑھے، دعائیں کرے، اور جب تک انسان نوافل ادا نہیں کرتا، عام طور پر اس وقت تک فرائض و واجبات میں بھی استقامت پیدا نہیں ہوتی۔ یا مثلاً تہجد کی نماز ہے، آدمی روز یہ سوچتا ہے کہ تہجد کی نماز پڑھنی چاہیے، اب شیطان اس کو یہ نہیں کہے گا کہ تہجد مت پڑھنا، اس سے تمہاری نیند خراب ہوگی، بلکہ اس طرح بہکائے گا کہ ہاں تہجد پڑھنا بڑی اچھی بات ہے، لیکن انشاء اللہ کل سے شروع کریں گے، اور کل الارم لگا کر سوئیں گے، جب کل آئی تو کوئی اور عذر کر دیا کہ آج تو نیند کا غلبہ ہے، کل سے شروع کریں گے۔ اس طرح وہ ٹالتا رہے گا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "صحت" کی جو نعمت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، جس میں وہ تہجد کی نماز پڑھ سکتا تھا، وہ نعمت اسی ٹالنے میں برباد ہو رہی ہے۔

جنت اور مغفرت کی طرف دوڑو

یا آج فراغت حاصل ہے، تہجد پڑھنے کے لئے وقت نکال سکتا ہے، لیکن اس کو ٹال کر وقت برباد کر رہا ہے۔ اس حدیث کا پیغام یہ ہے کہ جب بھی کسی نیک کام کا موقع ملے، یا نیک کام کا خیال آئے تو پھر اس کو انجام دینے میں دیر مت کرو، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ

(آل عمران: ۱۳۳)

فرمایا کہ اپنے پروردگار کی مغفرت حاصل کرنے کی طرف تیزی سے دوڑو، اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، بلکہ اس آیت کا یہ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر کرو، اور اس مغفرت اور جنت کی طرف جانے کے لئے ریس لگاؤ۔

نیک کام کو ٹالو نہیں

شیطان کا کام ہے "ٹالنا" اور پیغمبر کا کہنا ہے کہ جس نیک کام کے کرنے کا خیال اور موقع آیا ہے، اس کو ٹالو نہیں، بلکہ اسی وقت کر گزرو، اگر اس کو کل پر ٹالو گے تو پتہ نہیں کل موقع رہے یا نہ رہے، کل کو وقت ملے یا نہ ملے، کل کو یہ جذبہ موجود رہے یا نہ رہے، کچھ پتہ نہیں۔

نیک کام کا خیال "اللہ کا مہمان" ہے

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو نیک کام کرنے کا خیال دل میں آتا ہے کہ فلاں نیک کام کرلوں، اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں "وارد" کہتے ہیں، یعنی دل میں یہ بات وارد ہوئی کہ میں فلاں کام کرلوں، نماز پڑھ لوں، تہجد پڑھ لوں، اوابین پڑھ لوں، اشراق پڑھ لوں، چاشت پڑھ لوں، صدقہ کردوں، مسلمان بھائی کی مدد کردوں، کسی کا دکھ دور کرنے کی کوشش کرلوں، اس قسم کے خیال کو "وارد" کہتے ہیں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ "وارد" اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہمان ہوتا ہے، اگر تم نے اس کی تھوڑی سی قدر کرلی، خاطر مدارت کرلی تو یہ مہمان پھر آئے گا۔ خاطر مدارت اس طرح کی کہ جس نیکی کا خیال دل میں آیا تھا، اس پر عمل بھی کرلیا تو یہ مہمان دوبارہ آئے گا، اور تمہیں کسی دوسرے نیک کام کی دعوت دے گا، اور اگر تم نے اس کی خاطر مدارت نہیں کی تو چونکہ یہ مہمان بڑا غیرت مند

ہے، اور بڑا غیور مہمان ہے، اگر تم نے ایک مرتبہ اس کی خاطر مدارت نہیں کی تو یہ مہمان تمہارے پاس آنا چھوڑ دے گا۔ اور اس وقت سے پناہ مانگو جب یہ مہمان آنا چھوڑ دے، اور "مہمان آنا چھوڑ دے" کے معنی یہ ہیں کہ اب دل میں نیکی کا خیال ہی نہیں آرہا ہے، اس وقت سے اللہ تعالیٰ بچائے، اور اب دل پر مہر لگ گئی، اور دل پر زنگ لگ گیا، اب نیک کام کرنے کا خیال ہی دل میں نہیں آتا۔

گناہ چھوڑنے کا کام مت ٹالو

بہرحال! اپنی اصلاح کو کس بات پر ٹال رہے ہو؟ گناہ چھوڑنے کو کس وجہ سے ٹال رہے ہو؟ مثلاً کوئی مسلمان صاحب ایمان کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے، اور کسی گناہ کا عادی بن گیا ہے، تو اب صاحب ایمان ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ یہ گناہ مجھے چھوڑنا چاہیے، اب شیطان اس کو اس طرح نہیں بہکائے گا کہ یہ تم بڑا اچھا کام کر رہے ہو، لہٰذا اس کو کیے جاؤ، اس لئے کہ وہ شیطان جانتا ہے کہ یہ شخص صاحب ایمان ہے، اور یہ میری بات نہیں مانے گا، بلکہ شیطان اس سے کہے گا کہ یہ کام تو بہت خراب ہے، اور اس کام کو چھوڑنا ہے، لیکن ایک مرتبہ کرلو، پھر چھوڑ دینا۔ جب ایک مرتبہ وہ گناہ کرلیا تو پھر کہے گا کہ ایک مرتبہ اور سہی، پھر چھوڑ دینا، اس طرح وہ انسان کو گناہ کے اندر لگائے رکھتا ہے، اور اس کو نجات نصیب نہیں ہوتی۔

گناہوں سے نجات کا یہ طریقہ نہیں

گناہوں سے نجات کا یہ راستہ نہیں کہ آدمی یہ سوچے کہ میں ایک مرتبہ اور یہ گناہ کرلوں، پھر چھوڑ دوں گا، بلکہ گناہوں سے نجات کا راستہ یہ ہے کہ آدمی آج ہی سے وہ گناہ چھوڑ دے، اپنے دل پر چوٹ لگا کر اپنے آپ کو گناہوں سے فارغ

کرو، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ شیطان کا ایک بڑا دھوکہ جس میں وہ اچھوں اچھوں کو مبتلا کر دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے کہ چلو یار یہ گناہ کر ہی لو، تاکہ دل میں اس کی حسرت باقی نہ رہے، بلکہ ایک ہی مرتبہ بھڑاس دل سے نکل جائے، ورنہ کل کو دل میں یہ حسرت رہے گی کہ تم نے یہ کام نہیں کیا تھا۔ اس لئے ایک مرتبہ یہ گناہ کر گزرو، پھر توبہ کر لینا، استغفار کر لینا، اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس طرح شیطان اس کو بہکاتا ہے، اور وہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر بیٹھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے، آمین۔

گناہ کرنے سے تسکین حاصل نہیں ہوتی

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شیطان کا انتہائی فتنہ انگیز حربہ ہے، اس لئے کہ وہ شخص جب ایک مرتبہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر گزرا تو اب آسانی سے وہ گناہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے کہ اب تک اس کو گناہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا، جب ایک مرتبہ گناہ کر لیا تو اس کے اندر اب حوصلہ پیدا ہو گیا، اور جب حوصلہ پیدا ہو گیا تو اب اس گناہ کی خواہش میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔ کیونکہ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو کبھی بھی تسکین نہیں بخشتا، یہ نہیں ہوتا کہ ایک مرتبہ گناہ کر کے فارغ ہو گئے اور اب دل بھر گیا۔ گناہ کی مثال تو خارش کی سی ہے کہ کھجاتے رہو، اور مزہ لیتے رہو، لیکن کھجانے کے نتیجے میں کبھی بھی تسکین نہیں ہوگی، بلکہ بیماری اور بڑھتی چلی جائے گی۔ یہی گناہ کی خاصیت ہے، اس سے کبھی بھی تسکین نہیں ہو سکتی، جب ایک مرتبہ گناہ کرے گا تو پھر خواہش اور زیادہ بھڑکے گی، پھر گناہ کرے گا تو اور بھڑکے گی، پھر گناہ کرے گا تو اور بھڑکے گی، یہ سوچنا کہ ایک مرتبہ گناہ کر کے جی بھر لوں گا، یہ شیطان کا زبردست دھوکہ ہے، جب

تک انسان اس کے اندر مبتلا رہے گا، کبھی بھی اس کو گناہ چھوڑنے کی توفیق نہیں ہوگی۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر لینا حماقت ہے

شیطان یہ جودھوکہ دیتا ہے کہ گناہ کر لے، پھر توبہ کر لینا، ارے اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ توبہ کا موقع ملے گا، اور توبہ کی توفیق ہوگی یا نہیں؟ کیا کسی نے ضمانت دیدی ہے کہ مرنے سے پہلے توبہ کا موقع مل جائے گا؟ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ توبہ کے بھروسے پر گناہ کر لینا ایسا ہی ہے جیسے عمل کے بھروسے پر بچھو سے کٹوا لینا، اور اس پر اپنا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ دارالعلوم کے قیام کے زمانے میں میں نے بچھو کے ڈسے کا عمل سیکھا تھا، اور بڑا مجرب عمل تھا، چنانچہ دیوبند کے پورے قصبے میں یہ بات سب کو معلوم تھی، جب بھی کسی کو بچھو ڈس لیتا تو اس کو فوراً میرے پاس لاتے، میں عمل پڑھ کر دم کر دیتا، فوراً وہ زہر اتر جاتا۔

ایک نصیحت آموز واقعہ

ایک مرتبہ رات کو میری والدہ کو اسٹور سے کچھ نکالنا کے لئے وہاں جانے کی ضرورت پیش آئی، اسٹور میں اندھیرا تھا، گھر میں ایک لالٹین تھی، اور میں اس وقت لالٹین کی روشنی میں کچھ لکھنے کا کام کر رہا تھا، میری والدہ نے کہ میں اسٹور میں جانا چاہتی ہوں، اور وہاں اندھیرا ہے، ذرا ایک منٹ کے لئے لالٹین مجھے دیدیں تو میں اپنا کام کرلوں، والد صاحب کو اپنے لکھنے کے کام میں خلل ڈالنا دشوار ہو رہا تھا، اس لئے والد صاحب نے کہا کہ ویسے ہی چلی جاؤ، وہ چیز اسٹور کے اندر سامنے ہی رکھی ہے، اٹھالو، والدہ صاحبہ نے کہا کہ وہاں تو بچھو ہوتے ہیں، اگر بچھو نے کاٹ لیا تو؟ والد صاحب فرماتے تھیں کہ اس وقت میرے منہ سے نکل گیا کہ اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟ مطلب یہ تھا کہ میرے پاس تو ایسا عمل موجود ہے

جس سے بچھو کے کاٹنے کا سارا اثر ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا تمہارا کیا نقصان کرے گا اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا۔ اب والدہ صاحبہ بغیر لالٹین کے چلی گئیں، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ والدہ کے اسٹور میں قدم رکھتے ہی بچھو نے کاٹ لیا۔ اب والد صاحب کے پاس آئیں تو والد صاحب نے اپنا وہی عمل شروع کیا، فرماتے ہیں کہ میں عمل کر کر کے تھک گیا، لیکن بچھو کا زہر اتر کے نہیں دیا۔ زہر اتارنے کے جتنے طریقے تھے، جو سینکڑوں مرتبہ کے آزمائے ہوئے تھے، وہ سب طریقے آزما لئے، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اس واقعہ سے تین سبق

فرمایا کہ اس واقعہ سے تین سبق ملے، ایک یہ کہ انسان کو کوئی بڑا بول منہ سے نہیں نکالنا چاہیے، اور میرے منہ سے یہ بڑا بول نکل گیا تھا کہ اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔ دوسرا سبق یہ ملا کہ کسی عمل میں، کسی دوا میں، کسی وظیفے میں، کسی تریاق میں کچھ نہیں رکھا، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہ ہو، شفاء انہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے، صحت انہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ تیسرا یہ سبق یہ ملا کہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر لینا ایسا ہی ہے جیسے عمل کے بھروسے پر بچھو سے کٹوا لینا، جیسے وہ حماقت اور بے وقوفی تھی، ایسے ہی یہ بھی حماقت اور بے وقوفی ہے، کیا معلوم کے گناہ کے بعد توبہ کی توفیق ہو یا نہ ہو، توبہ کے لئے وقت ملے یا نہ ملے، اس لئے کہ توبہ کی توفیق بھی اللہ کی عطا ہے، ان کی عطا کے بغیر توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ اور پھر جو آدمی اتنی جرأت کر رہا ہو کہ گناہ کر کے توبہ کر لوں گا، کچھ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے توبہ کی توفیق ہی سلب کر لیں، اللہ تعالیٰ اس سے حفاظت فرمائے، آمین۔

جب ہاتھ پاؤں حرکت کرنا چھوڑ دیں گے

بہرحال! وقت گزر رہا ہے، اور انسان دھوکہ میں پڑا ہوا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا حاصل یہ نکلا کہ صحت کے جو لمحات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہوئے ہیں، ان کو غنیمت سمجھو، اور اسی طرح فراغت کے جو لمحات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہوئے ہیں، ان کو غنیمت سمجھو، ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے کہ:

ابھی تو ان کی آہٹ پر میں آنکھیں کھول دیتا ہوں
وہ کیسا وقت ہوگا، جب نہ ہوگا یہ بھی امکاں میں

ابھی تو ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں، اس وقت اگر کچھ کرلو گے تو نیکیوں کا سرمایہ جمع ہو جائے گا، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب نہ ہاتھ چلیں گے، اور نہ پاؤں چلیں گے، کوئی شخص بھی اس وقت سے مستثنیٰ نہیں۔

کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟

ترمذی شریف میں ایک حدیث ہے، جس میں اسی مضمون کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اے اللہ کے بندو! نیک کام کرنے کے لئے کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ فرمایا:

هَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا فَقْرًا مُنْسِيًا، اَوْ غِنًى مُطْغِيًا، اَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا، اَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا، اَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا، اَوِ الدَّجَّالَ، فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ، اَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ۔

(ترمذی، کتاب الزھد، باب ما جاء فی المبادرۃ بالعمل)

کیا فقر و فاقہ کا انتظار ہے؟

"فَقْرًا مُنْسِيًا" کیا اس بات کا انتظار کر رہے ہو کہ ابھی تو پیسے ہیں، کل

صدقہ کردیں گے، پرسوں کردیں گے، تو کیا تم اس بات کا انتظار کررہے ہو کہ تمہارے اوپر فقر وفاقہ آجائے، مفلسی آجائے، جو فقر وافلاس تمہیں صدقہ وخیرات کرنے کو بھلا دے، کیا اس وقت کا انتظار کررہے ہو؟ کیا اس وقت صدقہ کرو گے؟ ارے بھائی! جب آج تمہارے پاس پیسے موجود ہیں تو ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو، کل کو معلوم نہیں کیا صورت ہو۔

کیا مالداری کا انتظار ہے؟

"اَوْ غِنًی مُّطْغِیًا" کیا تم ایسی مالداری کا انتظار کررہے ہو جو تمہیں سرکش بنا دے۔ یعنی نیک کام کو یہ سوچ کر ٹال رہے ہو کہ آج تو نفلیں پڑھنے کا موقع نہیں ہے، ابھی تو اپنی تجارت میں اور ملازمت میں مصروف ہوں، جب ذرا فارغ البالی حاصل ہوجائے گی تو اس وقت نفلیں بھی پڑھیں گے، اور تہجد بھی پڑھیں گے، اشراق اور چاشت بھی پڑھیں گے، اور صدقہ کریں گے، ابھی تو فارغ البالی نہیں ہے، ابھی تو ذرا تجارت کو ترقی دینی ہے، مال بڑھانا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ تم ایسی مالداری کا انتظار کررہے ہو جو تمہیں سرکش بنادے، کیا معلوم کہ جب خوشحالی اور مالداری حاصل ہوجائے تو دماغ سے اللہ کی یاد ہی نکل جائے، اور پھر نیکی کرنے کا خیال ہی ختم ہوجائے، اور پھر تکبر اور سرکشی میں ایسے مبتلا ہوجاؤ کہ پھر کسی نیکی کی طرف دھیان ہی نہ جائے۔

کیا بیماری کا انتظار ہے؟

"اَوْ مَرَضًا مُّفْسِدًا" یا اس وقت نیکی کو یہ سوچ کر ٹال رہے ہو کہ اس وقت ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں، صحت حاصل ہے، اور عافیت حاصل ہے، فلاں نیک کام کل سے کریں گے، پرسوں سے کریں گے، اس طرح ٹالتے ٹالتے تمہارے اوپر

کوئی بیماری آجائے، جو تمہیں فساد میں مبتلا کردے، اور پھر تم کچھ کرنے کے قابل ہی نہ ہو۔

کیا بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟

"اَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا" یا اس وقت نیک کاموں کو یہ سوچ کر ٹال رہے ہو کہ ابھی تو میں جوان ہوں، لہٰذا نیک کاموں کی کیا جلدی ہے، ابھی تو جوانی میں کچھ لذتیں حاصل کرلیں، جوانی کا کچھ مزہ لے لیں، جوانی میں عیش وعشرت کرلیں، جب ذرا عمر ڈھل جائے گی، اس وقت انشاء اللہ توبہ بھی کریں گے، اور نیکیاں بھی کریں گے، تہجد بھی پڑھیں گے، مسجد میں بھی جایا کریں گے، صدقہ وخیرات بھی کریں گے۔ آج یہ تصور بے شمار نوجوانوں کے ذہن میں رہتا ہے کہ ارے بھائی جوان ہیں، نیک کام کرنے کی کیا جلدی ہے، اور یہ لوگ ان نوجوانوں کو ملامت کرتے ہیں جو اللہ کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ کیا تم ایسے بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو جو تمہیں سٹھیا ڈالے، جب بڑھاپا آئے گا تو اس وقت تمہاری یہ حالت ہوگی کہ نہ منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت، نہ کام کرنے کی طاقت اور قوت، اس وقت اگر کوئی نیک کام کرنا بھی چاہو گے تو حسرت کے سوا اور کیا ہوگا، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیز گار

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبر یست

ارے بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی پرہیزگار بن جاتا ہے، اور بکریوں کو کھانے سے توبہ کرلیتا ہے، لیکن وہ اس لئے توبہ کرتا ہے کہ اب چیر پھاڑ کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی، اب اگر بکری پر حملہ کرنا چاہے، تب بھی نہیں کرسکتا، تو اب توبہ

کر کے بیٹھ گیا، تو کیا توبہ ہوئی؟ لہٰذا بڑھاپے میں توبہ کر لینا کوئی کمال نہیں، اس لئے کہ بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی توبہ کر لیتا ہے، پرہیزگار بن جاتا ہے، ہاں جوانی کی حالت میں توبہ کرنا، اللہ کے حکم کی خاطر اپنے نفس کی خواہشات کو کچلنا اور پامال کرنا، یہ ہے پیغمبروں کا شیوہ۔

یہ ہے شیوہ پیغمبری

حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے کہ بھرپور جوانی ہے، اور صحت کے اعلیٰ مقام پر ہیں، حسن ج کے اعلیٰ مقام پر ہیں، یہاں تک کہ دل میں گناہ کا خیال بھی آرہا ہے، لیکن خیال آنے کے باوجود اپنے کو اس گناہ سے بچایا، یہ ہے شیوہ پیغمبری۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ کیا تم نیک کاموں کے لئے بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو، جب کہ اس وقت تم کچھ کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔

کیا موت کا انتظار کر رہے ہو؟

پھر فرمایا "اَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا" کیا تم نیک کاموں کو ٹال کر موت کا انتظار کر رہے ہو، یاد رکھو موت تمہارے پاس اچانک آجائے گی، وہ سب قصہ ختم کر دے گی، پھر فرمایا "اَوِ الدَّجَّالَ، فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ" یا تم نیک کاموں کو ٹال کر دجال کا انتظار کر رہے ہو کہ جب دجال آجائے گا تو میں نیک کام کروں گا۔ ارے دجال تو وہ ہے کہ جتنی غائب چیزوں کا انتظار کر رہے ہو، ان میں سے بدترین چیز "دجال" ہے، جب دجال کا فتنہ آئے گا تو اس وقت پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور نیکی کا موقع نہیں ملے گا، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے فتنے سے پناہ مانگی۔ کیا تم قیامت کا انتظار کر رہے ہو؟ "اَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ" کہ جب قیامت آئے گی اس وقت نیک کام کریں گے، وہ قیامت تو بڑی مصیبت کی

چیز ہے، اس وقت توعمل کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ بہر حال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ اپنی اصلاح کے لئے، نیکیوں کی طرف بڑھنے کے لئے، گناہوں سے بچنے کے لئے، اور تقوی اختیار کرنے کے لئے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار بنانے کے لئے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنے کے لئے آخر کون سے وقت کا انتظار کر رہے ہو؟ کچھ نہیں! بلکہ ہم لوگ اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ صحت ہمیشہ رہے گی، اور فراغت ہمیشہ رہے گی۔

خلاصہ

بہر حال! یہ حدیث توجہ دلا رہی ہے کہ اس زندگی کے جو لمحات اللہ جل شانہ نے ہمیں عطا فرمائے ہوئے ہیں، اس کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے، اس کو تول تول کر خرچ کرو، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے کاموں میں خرچ کرو، اور نفس و شیطان سے مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرو، خواہشات کے غلام نہ بنو کہ جو جی میں آیا بس اس کے پیچھے چل پڑے، جو شخص نفس کا غلام ہو کر زندگی گزارے تو یہ کوئی زندگی نہیں، ایسی زندگی سے اللہ کی پناہ مانگو، کوشش بھی کرو، اس کے لئے دعا بھی کرو کہ اوقات زندگی صحیح مصرف پر خرچ ہوں، اور صحت و فراغت کے لمحات کی قدر رہو، اور اس کو صحیح طریقے پر خرچ کرنے کی توفیق ہو، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اور اپنی رحمت سے مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

وقت بڑی نعمت ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۶

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

وقت بڑی نعمت ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔ اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیه وسلم: نعمتان مغبون فیهما کثیر من الناس الصحة والفراغ۔

(بخاری، کتاب الرقاق، باب ما جاء فی الصحة والفراغ، حدیث نمبر ۶۰۴۹)

تمہید

بزرگان محترم و برادران عزیز! گذشتہ کل بھی میں نے یہی حدیث تلاوت کی تھی، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ”دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ

دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، ایک صحت کی نعمت اور دوسری فراغت کی نعمت" اس حدیث کا دوسرا ترجمہ اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ " دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں لوگ گھاٹے کے سودے میں ہیں" گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں نعمتوں کو تاجر کے مال تجارت سے تشبیہ دی ہے کہ یہ "وقت" ایک مال ہے، جیسے کوئی شخص تجارت میں اپنا سرمایہ لگا رہا ہے، وہ سرمایہ اس لئے لگاتا ہے تاکہ اس میں اضافہ ہو، بڑھوتری ہو، اور نفع ہو۔ لیکن اگر تجارت کے اندر فائدہ اور نفع ہونے کے بجائے اصل سرمایہ ہی ڈوب جائے تو یہ خسارہ ہے، نقصان اور گھاٹا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحت اور فراغت کو تاجر کے سرمائے سے تشبیہ دی ہے کہ یہ صحت جو تمہیں ملی ہوئی ہے، یا یہ فراغت جو تمہیں ملی ہوئی ہے، یہ تمہارا سرمایہ ہے، اور اس سرمائے کے ذریعے نفع حاصل ہونا چاہیے، اور وہ نفع یہ ہے کہ دنیا کے اندر بھی بہتری ہو، اور یہ صحت و فراغت آخرت کی بہبود کے لئے استعمال ہو۔

پھر وہ سرمایہ ڈوب گیا

اگر اس صحت کی نعمت کو ضائع کر دیا، ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کسی نفع بخش کام میں نہیں لگایا، بلکہ فضول ضائع کر دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سرمایہ ڈوب گیا۔ یا جو فراغت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہوئی تھی، اس کو غلط مصرف میں استعمال کر لیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سرمایہ ڈوب گیا۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن میں اکثر لوگ خسارہ اٹھاتے ہیں، اور ان کا سرمایہ بھی ڈوب جاتا ہے، اور نفع بھی حاصل نہیں ہوتا۔

عمرِ فسانہ ساز گزرتی چلی گئی

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عجیب و غریب تعلیم دی

ہے، اور حقیقت کو بیان فرمایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہم سب لوگ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، اوقات زندگی کو صحیح مصرف میں استعمال کرنے کی فکر نہیں ہے، اوقات زندگی بے فائدہ ضائع ہو رہے ہیں، ایک وقت ایسا آئے گا جس میں انسان حسرت کرے گا کہ کاش! میں ان اوقات زندگی کو صحیح کام میں خرچ کر لیتا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ آخر میں جا کر یہ انجام ہوتا ہے کہ:

میں دیکھتا ہی رہ گیا نیرنگِ صبح و شام
عمرِ فسانہ ساز گزرتی چلی گئی

یعنی صبح شام ہو گئی، شام صبح ہو گئی، دن گزرتے چلے گئے، گزرتے چلے گئے، اور اس وقت میں جو کام کرنا چاہیے تھا، وہ نہ کر سکا۔

پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو

انبیاء علیہم السلام اسی لئے تشریف لاتے ہیں تاکہ وہ ہمیں اور آپ کو اس پر متنبہ کریں کہ خدا کے لئے اس نعمت کی قدر کر لو، یہ صحت جو ملی ہوئی ہے، یہ ہمیشہ رہنے والی نہیں، فراغت کے جو لمحات ملے ہوئے ہیں، وہ ہمیشہ رہنے والے نہیں، ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ، شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ، وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ۔

(مشکاۃ، کتاب الرقائق، رقم ۵۹۸۷)

جوانی کو غنیمت سمجھو

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو، ایک یہ کہ اپنی جوانی کو

غنیمت سمجھو، قبل اس کے کہ بڑھاپا آجائے، جوانی میں طاقت ہے، قوت ہے، جذبہ ہے، کرنا چاہو گے تو اس جوانی کو استعمال کر کے پہاڑ بھی ڈھو سکتے ہو، اور محنت کر کے اپنے لئے آخرت میں ذخیرہ کر سکتے ہو۔ لیکن جب یہ جوانی گزر جائے گی، اور بڑھاپا آجائے گا، تو ہاتھ پاؤں نہیں چلیں گے، ان میں طاقت ختم ہو جائے گی، اس وقت اگر کرنا بھی چاہو گے تو نہیں کر سکو گے۔

صحت کو غنیمت سمجھو

دوسرے یہ کہ "بیماری" سے پہلے "صحت" کو غنیمت سمجھو، کیونکہ جب بیماری آجائے گی تو پھر کچھ نہیں بن پڑے گا، تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت دی ہے اس کو غنیمت سمجھو، قبل اس کے کہ فقر و فاقہ کی نوبت آجائے، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اس کو اس کے صحیح مصرف پر خرچ کر لو، جب فقر آجائے گا تو پھر کچھ نہیں کر سکو گے۔

عبرتناک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ میں ایک واقعہ بیان فرمایا جو بڑا عبرتناک ہے، وہ یہ کہ ڈھاکہ میں ایک نواب صاحب تھے، بہت بڑے رئیس اور صاحب جائیداد تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو بہت دولت چھوڑ گئے، ان کا ایک بیٹا تھا، اور ایک بیٹی تھی، یہ دونوں تو نواب زادے تھے، ان کے دماغ عرش معلی پر رہتے تھے، کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں، اور اپنے تکبر اور غرور میں مست تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ صاحب زادے کو ماچس جلانے کی ضرورت پیش آگئی، اور جب تیلی کو ماچس پر رگڑا، اور تیلی جل گئی تو اس میں سے ایک بُو نکلی، اور وہ بُو صاحب زادے کو بہت پسند آگئی کہ یہ بو بہت اچھی ہے، چنانچہ اس کے بعد صبح سے

لے کر شام تک ان کا یہ مشغلہ ہو گیا کہ ماچس خریدی جا رہی ہیں، اور یہ صاحب زادے اس کو جلا کر اس کی بُو سونگھے جا رہے ہیں، اور اس سے لطف لے رہے ہیں، اور اس میں پیسہ برباد ہو رہا ہے۔

صاحب زادی کا حال

صاحب زادی ایک مرتبہ بازار گئیں، اور کپڑا خریدا، اور جب دکاندار نے قینچی سے کٹ لگا کر ہاتھ سے کپڑا پھاڑا تو اس کی آواز صاحب زادی کو پسند آگئی، اب واپس گھر آ کر بازار سے مزید کپڑے منگوا کر ان کو پھڑوایا جا رہا ہے، اب دن رات صاحب زادی کا یہی مشغلہ ہو گیا کہ کپڑوں کے تھان کے تھان منگواتیں، اور ان کو اپنے سامنے پھڑواتیں، اور اس کی آواز سن کر لطف اندوز ہوتیں، اور اسی میں پیسہ برباد ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری دولت انہی دو مشغلوں میں ختم ہو گئی، اور بعد میں یہ دونوں بھیک کا پیالہ لے کر بازار میں مانگا کرتے تھے، اور جس بازار میں مانگتے تھے، وہ آج بھی ''بیگم بازار'' کے نام سے مشہور ہے۔ ایک وقت تھا جب اپنا روپیہ پیسہ صحیح مصرف میں خرچ کر سکتے تھے، لیکن ایسا وبال آیا کہ فقر و فاقہ کی نوبت آگئی، اب اگر صحیح مصرف پر خرچ کرنا بھی چاہیں تو اس کا کوئی راستہ نہیں، اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مال اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کو غنیمت سمجھو، قبل اس کے کہ وہ مال چھن جائے۔

فرصت کو غنیمت سمجھو

چوتھا یہ کہ ''وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ'' یعنی جب فرصت میسر ہو، اور آدمی کے پاس وقت ہو، اس کو غنیمت سمجھے، قبل اس کے کہ مشغولیت آجائے، اور کوئی وقت کام کرنے کے لئے نہ ملے۔ آخر میں فرمایا ''وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ'' گویا کہ آخر میں

خلاصہ دیدیا کہ مرنے سے پہلے زندگی کو غنیمت سمجھو، یہ زندگی سرمایہ ہے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمایا ہوا ہے، اس کو صحیح طریقے سے استعمال کرلو، اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، اگر اس کو صحیح طریقے سے استعمال کرلو گے تو یہی زندگی آخرت کا سرمایہ بن جائے گی۔

زندگی کو تول تول کر خرچ کرو

یہ جو حکم ہے کہ موت کی تمنا مت کرو، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر اس وقت موت آگئی کیا پتہ کیا انجام ہوگا، اور اس وقت جو زندگی ملی ہوئی ہے اس کا ایک ایک لمحہ اس وجہ سے قیمتی ہے کہ نجانے کون سا لمحہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے کسی کام میں صرف ہو جائے، وہ تمہارا بیڑا پار کرادے۔ اس لئے اس زندگی کو غنیمت سمجھو، اس لئے کہ یہ زندگی تمہاری نہیں ہے کہ تم اپنی ملکیت سمجھ کر جس طرح چاہو خرچ کرو، یہ امانت ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں دی گئی ہے، اور اس مقصد کے لئے دی گئی ہے کہ تم اس کے ذریعہ آخرت کا سرمایہ بناؤ۔ لہٰذا اس زندگی کو تول تول کر خرچ کرو۔

”فرصت نہیں“ ایک بہانہ ہے

آج ہم اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ کیا ہمارے اوقات صحیح استعمال ہو رہے ہیں؟ یہ زندگی صحیح مصرف پر گزر رہی ہے؟ فضولیات میں، بے فائدہ کاموں میں، لایعنی امور میں تو خرچ نہیں ہو رہی ہے؟ ہر آدمی اس کا جائزہ لے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ زندگی کا اکثر نہیں تو بہت بڑا حصہ ہم فضولیات میں خرچ کر دیتے ہیں، آج جس سے بات کرو تو ایک جملہ ہر آدمی کی زبان پر ہے کہ ”فرصت نہیں ہے“ ”وقت نہیں ہے“ کیوں فرصت نہیں؟ اگر تم حساب کر کے وقت خرچ کرو تو تمہیں فرصت ہی فرصت مل جائے۔

پچاس سال پہلے کا تصور

آج سے پچاس سال پہلے کا تصور کرو تو اس میں نہ گیس کی سہولت ہے، نہ مصالحہ پیسنے کی مشین ہے، نہ آٹا گوندنے کی مشین ہے، ہر کام ہاتھ سے کیا جارہا ہے، چولھا جلانے کے لئے آدھا گھنٹہ درکار ہے، اگر چائے بھی پکانی ہو تو صرف چولھا جلانے کے لئے آدھا گھنٹہ چاہیے۔ اس وقت یہ صورت ہے کہ چولھے کا کان مروڑا، اور چولھا جل گیا، اب یہ آدھا گھنٹہ بچ گیا، سوال یہ ہے کہ آدھا گھنٹہ کہاں گیا؟ پہلے خواتین خود چکی میں آٹا پیستی تھیں، پھر آٹا خود گوندتیں، پھر روٹی پکاتیں، اب تو پسا ہوا آٹا موجود ہے، مشین نے اس کو گوندھ دیا، اس کو خاتون نے توے پر ڈالا، روٹی پک گئی۔ پہلے مصالحے سِل پر پیسے جاتے تھے، اب مشین کے ذریعہ ایک منٹ میں مصالحہ تیار۔ پہلے سفر میں بہت وقت لگتا تھا، لاہور جانا ہو، ریل سے جائیں تو چوبیس گھنٹے پہنچنے میں لگتے تھے، اب ہوائی جہاز سے صبح جاؤ، اور شام کو کام کر کے کراچی واپس آجاؤ، یہ سارا وقت بچ گیا، لیکن یہ وقت کہاں گیا؟ پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ "فرصت نہیں ملتی" "وقت نہیں ملتا" یہ سارا وقت فضولیات میں چلا گیا، ٹیپ ٹاپ میں یہ وقت گیا، لایعنی امور میں گیا، لیکن کسی صحیح مصرف میں استعمال نہیں ہوا۔

"ام الامراض" وقت کی قدر نہ کرنا

میرے بھائیو! میں آپ سے پہلے اپنے آپ سے خطاب کر کے کہتا ہوں کہ اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو یہ نظر آئے گا کہ ہماری بہت بڑی بیماری جو "ام الامراض" ہے، وہ "وقت کی قدر نہ کرنا" ہے، اور اوقات کو لایعنی امور میں صرف کرنا ہے، کبھی کہیں کھڑے ہو گئے، اور فضول باتیں شروع کر دیں، اور وقت ضائع کر دیا، جس کے نتیجے میں نہ اوقات میں برکت رہتی ہے، اور نہ ہی کام نمٹتے ہیں، اور یہ رونا ہر

وقت رہتا ہے کہ ''وقت نہیں'' ''فرصت نہیں''۔ اگر اللہ تعالیٰ وقت کی قدر پہچاننے کی توفیق دے تو یہ سارا مسئلہ حل ہو جائے۔ مثلاً آپ کسی کی عیادت کرنے کے لئے گئے تو جو سنت طریقہ عیادت کرنے کا ہے، اگر اس طریقے سے عیادت کرو گے تو نہ اپنا وقت ضائع ہوگا اور نہ ہی دوسرے کا وقت ضائع ہوگا، نہ یہ کہ وہاں جا کر جم کر بیٹھ گئے، اپنا وقت بھی ضائع کر رہے ہیں، اور دوسرے کا وقت بھی ضائع کر رہے ہیں۔ یا مثلاً کسی سے ملاقات کے لئے گئے تو سنت طریقے سے ملاقات کرو، ضرورت کی بات کر کے اور تھوڑا بہت ہنسی مذاق کر کے رخصت ہو جاؤ، لیکن ملاقات کے اندر گھنٹے گزار دینا تو اپنے سرمائے کو فضول ضائع کر دینا ہے، جیسے نواب زادے نے ماچس جلانے میں اپنا سرمایہ ضائع کر دیا تھا، یا جیسے نواب زادی نے کپڑے پھاڑنے میں اپنا سرمایہ ضائع کر دیا تھا، اسی طرح ہم لوگ بھی فضولیات میں اپنے وقت کا سرمایہ ضائع کرتے رہتے ہیں۔

بزرگوں کا وقت کو استعمال کرنے کا انداز

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اوقات کو تول تول کر خرچ کرو، مثلاً پہلے سے یہ ذہن میں رہے کہ فلاں موقع پر مجھے پانچ منٹ کا وقت ملے گا، میں اس میں فلاں کام کر لوں گا۔ جن اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ وقت کی قدر پہچاننے کی توفیق عطا فرماتے ہیں، ان کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہوتا، اور کچھ نہیں تو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے زبان پر اللہ کا ذکر جاری ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ، جو اونچے درجے کے محدث، فقیہ اور عالم تھے، تصانیف کے دریا بہا دیے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ لکڑی کے قلم سے لکھتے، تو لکھتے لکھتے قلم کی نوک جب گھس جاتی تو چاقو سے اس پر قط لگانے کی ضرورت پیش آتی، جتنی دیر قلم پر چاقو سے قط لگاتے، اس

وقت کو بھی ضائع نہیں کرتے تھے، اس وقت کو ذکر اللہ میں صرف کرتے تھے۔

بے فائدہ کاموں میں وقت ضائع کرنا

بہر حال صبح سے شام تک کے اوقات کا جائزہ لو کہ میں ان اوقات کو کہاں خرچ کر رہا ہوں، مفید کاموں میں خرچ کر رہا ہوں، یا فضول کاموں میں خرچ کر رہا ہوں، یا مضر کاموں میں خرچ کر رہا ہوں۔ یاد رکھیے! جو وقت بے فائدہ اور فضول کاموں میں صرف ہو رہا ہے وہ بھی درحقیقت مضر ہی ہے، کیونکہ وقت کا سرمایہ بے کار ضائع ہو رہا ہے۔ دیکھیے! تاجر ہر وقت اپنا فائدہ دیکھتا ہے، اگر کسی کام میں فائدہ نہ ہو تو فائدہ نہ ہونے کو وہ نقصان سے تعبیر کرتا ہے، حالانکہ نقصان تو اصل میں اس کو کہا جائے گا جب سرمایہ ڈوب جائے، لیکن تاجر نفع نہ ہونے کو بھی نقصان میں شمار کرتے ہیں۔

چار پیسے کا فائدہ

ہمارے ایک دوست حکیم نظامی صاحب مرحوم تھے، وہ ایک دن قصہ سنا رہے تھے کہ یہ جو بنیے ''ہندو تاجر'' ہوتے تھے، یہ ہر قسم کی تجارت کرتے تھے، اور تجارت میں بڑے ماہر ہوتے تھے، اگر وہ بنیا ''میمن'' بھی ہو تو وہ اور زیادہ ماہر ہوتا تھا، جیسے ''کریلا نیم چڑھا'' ہمارے ایک میمن دوست یہ سنا رہے تھے کہ ہمارے یہاں میمنوں میں یہ بات مشہور ہے کہ ایک میمن تاجر کا جب انتقال ہوا تو اس سے فرشتوں نے پوچھا کہ تمہیں ''جنت'' میں لے جائیں یا ''جہنم'' میں لے جائیں؟ تو اس تاجر نے جواب دیا کہ جہاں چار پیسے کا فائدہ ہو، وہاں لے جائیں۔

ایک بنیے کا قصہ

بہر حال ایک بنیا عطار تھا، دواؤں اور عطروں کی دکان تھی، ایک دن اس کو

کہیں جانا پڑ گیا تو اس نے دکان پر اپنے بیٹے کو بٹھا دیا، اور اس سے کہا کہ دیکھو! ذرا خیال سے کام کرنا، اور دیکھو! یہ دو شیشیاں بظاہر دیکھنے میں ایک جیسی لگتی ہیں، لیکن ان دونوں کی قیمت میں بڑا فرق ہے، یہ شیشی دو روپے کی ہے، اور یہ دوسری شیشی دو سو روپے کی ہے، اس لئے احتیاط سے کام لینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دو سو والی شیشی دو روپے میں فروخت کر دو، اور اس کے نتیجے میں بڑا نقصان ہو جائے، بیٹے نے کہا ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا، اس کے بعد وہ چلا گیا، اس کے جانے کے بعد وہ بیٹا اپنے دماغ میں یہ بات بٹھا رہا تھا کہ یہ بوتل دو روپے کی ہے، اور یہ بوتل دو سو روپے کی ہے، بار بار اس کا ذہن میں تکرار کرتا رہا، یہاں تک کہ ایک خریدار آ گیا، تو بیٹے نے غلطی سے دو سو روپے والی بوتل دو روپے میں فروخت کر دی۔ جب بنیا واپس آیا تو بیٹے سے پوچھا کہ کیسا رہا، اور ان بوتلوں میں سے کوئی بوتل تو نہیں بکی؟ بیٹے نے کہا کہ ہاں ایک بوتل بکی، پوچھا کہ کتنے میں بیچی؟ بیٹے نے کہا: دو روپے میں، وہ بنیا ماتھا پکڑ کر بیٹھ گیا کہ تو نے میرا اتنا نقصان کر دیا، تو حرام خور ہے، میں تجھے اتنا سمجھا کر گیا تھا، مجھے جس بات کا خطرہ تھا، وہ ہی ہوا، بیٹے کو خوب ڈانٹا۔ اس بیٹے کو بڑا افسوس ہوا کہ میں نے باپ کا نقصان کر دیا، اب اس بیٹے پر ندامت، شرم، پشیمانی، اور صدمہ طاری ہو گیا، اور سارا دن اسی صدمے میں گزر گیا کہ میں نے اپنے باپ کا اتنا بڑا نقصان کر دیا، جب سارا دن اس طرح گزر گیا کہ صدمے کی وجہ سے بیٹے نے نہ کچھ کھایا، نہ کچھ پیا تو بنیے نے کہا بیٹے! خیر جو نقصان ہونا تھا، وہ ہوا، لیکن یہ تم نے جو بوتل دو روپے کی بیچی اس میں چھ پیسے پھر بھی نفع کے ہیں، اپنی جیب سے کچھ نہیں گیا، البتہ جو غم ہے وہ اس بات کا ہے کہ جو نفع کمانا تھا، وہ نہیں کمایا، ورنہ اصلی سرمایہ نہیں ڈوبا۔

فائدہ نہ ہونا نقصان ہے

بہرحال تاجر اس حساب سے کام کرتا ہے کہ اگر نفع نہیں ہوا تو وہ بھی نقصان اور گھاٹا ہے۔ اسی طرح زندگی کے لمحات کے اندر یہی حساب کرلو کہ زندگی کے جس لمحے سے دنیا کا یا آخرت کا فائدہ نہیں پہنچا تو وہ بھی نقصان اور گھاٹا ہے، اس لئے کہ یہ عمرِ عزیز گزرتی چلی جارہی ہے۔ اب دو باتیں عرض کرتا ہوں، جو بزرگوں سے سنی ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس پر عمل کی توفیق عطا فرمادے تو انشاء اللہ اللہ کی رحمت سے۔ یہ ہے کہ زندگی کارآمد ہوجائے گی، وہ دو باتیں یہ ہیں۔

وقت کی اہمیت کا احساس پیدا کرو

پہلی بات یہ کہ ذہن میں اس بات کی اہمیت بٹھاؤ کہ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، وقت کی اہمیت کا احساس دل میں بٹھائیں، اگر وقت کی اہمیت کا احساس ہی نہ ہو تو پھر بات آگے نہیں چل سکتی، میں بے شمار لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ ان کے دلوں میں وقت کی اہمیت کا احساس ہی نہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بات چیت میں گزار دیا تو اس میں کیا نقصان ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت کی اہمیت کا احساس ہی نہیں، جو حدیث میں نے تلاوت کی اس کے الفاظ کو یاد کرو، اور پھر بار بار اس کا تصور کرو جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمارہے ہیں کہ:

نعمتان مغبون فیھما کثیر من الناس الصحة و الفراغ۔

(بخاری، کتاب الرقائق، باب ما جاء فی الصحة والفراغ، حدیث نمبر ۶۰۴۹)

اور آپ کے دوسرے ارشاد کا تصور کرو جس میں آپ نے فرمایا:

اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ، وَشَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ،
وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ، وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَفَرَاغَكَ

قَبْلَ شُغْلِكَ، وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ ـ

(مشکاۃ، کتاب الرقاق، رقم ۵۱۷۴)

جب بار بار ان احادیث کے الفاظ اور معانی کا تصور دل میں لاؤ گے تو رفتہ رفتہ وقت کی اہمیت دل میں پیدا ہوگی، اور اس کے نتیجے میں وقت ضائع کرنے سے بچنے کی کوشش کرو گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت سے ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور وقت ضائع کرنے سے بچائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

نظام الاوقات کی اہمیت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ١٦

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظام الاوقات کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ،
وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ
فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ
وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا
عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ
وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا

اما بعد فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: نِعْمَتَانِ
مَغْبُوْنٌ فِیْھِمَا کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ اَلصِّحَّۃُ وَالْفَرَاغُ۔

(بخاری، کتاب الرقاق، باب ماجاء فی الصحۃ والفراغ، رقم الحدیث: ۶۰۴۹)

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ایک حدیث کا بیان گذشتہ دو دنوں سے
چل رہا ہے، جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحت اور وقت کی اہمیت

کو بیان فرمایا ہے، وقت کو صحیح مصرف میں لانے اور ضائع ہونے سے بچانے کا بہترین "گر" یہ ہے کہ صبح بیدار ہونے سے لے کر شام تک اور رات کو سونے تک کے تمام اوقات کا ایک ٹائم ٹیبل بنالو، اور پھر اسی ٹائم ٹیبل کے مطابق زندگی کے ایام گزارنے کی کوشش کرو۔

اپنا نظام الاوقات بنالو

صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا جائزہ لے کر اپنی ضروریات اور اپنے مشاغل کا حساب کریں کہ کس کام کے لئے کتنے وقت کی ضرورت ہے، اس ضرورت کے اعتبار سے اپنا نظم الاوقات مقرر کرلو، اس نظم میں اپنے نفس کے حقوق کا بھی لحاظ رکھو، اپنے گھر والوں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھو، اپنے اوپر جو ذمہ داریاں ہیں، ان کا بھی لحاظ رکھو، اور دنیا وآخرت کے سارے کاموں کا لحاظ رکھتے ہوئے نظام الاوقات بناؤ، مثلاً سونے کے لئے ٦ گھنٹے سے ٨ گھنٹے کا وقت مقرر کرلو، کھانے کے لئے کتنا وقت درکار ہوگا، وہ مقرر کرلو، گھر والوں کے ساتھ کتنا وقت گزارنا ہے، اس کو مقرر کرلو، عبادات میں کتنا وقت صرف ہونا چاہیے، اپنے معاشی مشاغل میں کتنا وقت صرف ہونا چاہیے، اپنے علمی مشاغل میں کتنا وقت صرف ہونا چاہیے، غرض یہ کہ ان سب باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نظام الاوقات بناؤ۔

شیطان کی کوشش

جب ایک مرتبہ نظام الاوقات بنالیا تو اب اس کی پابندی کرو، نظام الاوقات میں ساری باتوں کی رعایت کرلو، اس بات کا پورا عزم رکھو کہ نظام الاوقات میں جس کام کے لئے جو وقت مقرر کیا ہے یہ وقت اسی کام میں صرف

ہوگا، چاہے دل پر آرے چل جائیں، چاہے اس کام میں دل نہ لگ رہا ہو، چاہے اس کام سے دل گھبرا رہا ہو۔ یاد رکھیے کہ جب آپ نظام الاوقات بنا کر اس کے اندر کام کریں گے تو شیطان ضرور دخل دیگا، اور اس میں ڈنڈی مارنے کی کوشش کرے گا، اور تمہارا دل اس کام سے ضرور گھبرائے گا، اور دل اس کام میں نہیں لگے گا، بس یہی امتحان کا وقت ہے، اگر اس دل گھبرانے کے نتیجے میں تم نے کام چھوڑ دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان تم پر غالب آگیا، اور تم نے شیطان کی بات مان لی۔

شیطان کمزور ہے

اور اگر تم نے یہ ٹھان لی کہ نہیں، میرا دل لگے یا نہ لگے، دل گھبرائے یا نہ گھبرائے، میں یہ کام ضرور کروں گا، اس لئے کہ میں دل لگنے کا پابند نہیں، میں تو یہ وقت اسی کام میں صرف کروں گا، جب یہ تہیہ کرلو گے تو شیطان بہکانا چھوڑ دے گا۔ شیطان بہت کمزور ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفًا (النساء:۷۶)

یعنی شیطان کا مکر بہت کمزور ہے۔ اس لئے یہ شیطان اس پر حاوی ہوتا ہے جو اس کے آگے دب جائے، یہ شیطان کمینہ دشمن ہے، اور کمینہ دشمن کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس کے سامنے بھیگی بلی بن جائے تو وہ دشمن شیر ہو جاتا ہے، اور اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے، اور جو شخص اس دشمن کے سامنے ڈٹ جائے تو یہ دب جاتا ہے۔

شیطان ڈھیر ہو جائے گا

لہٰذا اگر شیطان کے سامنے تم نے ہتھیار ڈال دیے اور یہ کہا کہ ابھی تو

کام کرنے سے دل گھبرا رہا ہے، ابھی تو نیند آ رہی ہے، حالانکہ نیند کا چھ گھنٹے کا وقت پورا ہو چکا ہے، یا سستی ہو رہی ہے، اور آپ کام چھوڑ کر نیند اور سستی کے چکر میں لیٹ گئے، گویا کہ شیطان نے تم کو دبا لیا، اور تم دب گئے۔ اور اگر تم نے کہا کہ نہیں، نیند آئے، یا سستی ہو، یا کچھ بھی ہو، یہ وقت تو میرا فلاں کام کرنے کا ہے، میں وہی کام کروں گا، تو بس شیطان وہیں ڈھیر ہو جائے گا۔ بہر حال دل لگے یا نہ لگے، کام چلے یا نہ چلے، اس لئے کہ بعض اوقات یہ بھی ہوگا کہ جس کام کے لئے وقت مقرر کیا تھا، بظاہر وہ کام پورا نہیں ہو رہا ہے، تو یہ تہیہ کر لے کہ چاہے پورا نہ ہو رہا ہو، لیکن میں اسی کام کے لئے بیٹھوں گا، بہر حال! اپنے نفس پر زبردستی کیے بغیر کام نہیں ہوتا۔

ہر کام میں ایک مرحلہ

میں آپ کو تجربہ کی بات بتاتا ہوں، وہ یہ کہ جو کام پابندی سے کرنے کا ہوتا ہے، اس میں ایک ایسا مرحلہ ضرور آتا ہے کہ جس میں آدمی اس کام سے گھبرا جاتا ہے، بس وہی مرحلہ امتحان کا وقت ہے، اگر تم گھبرا کر وہ کام چھوڑ بیٹھے تو سمجھ لو کہ شیطان تم پر حاوی ہو گیا۔ اور اگر تم نے اس مرحلہ پر یہ ٹھان لی کہ نہیں، میں یہ کام کر کے رہوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم شیطان پر غالب آ گئے، اور تم فتح یاب ہو گئے، پھر ان شاء اللہ آئندہ کے لئے آسانی ہو جائے گی۔

کب تک دل کی گھبراہٹ کے غلام رہو گے

یہ گُر کی بات یاد رکھنا کہ جو "نظم الاوقات" مقرر کیا ہے، اس پر زبردستی اپنے آپ سے عمل کرانا ہے، مثلاً ایک وقت آپ نے تلاوتِ قرآن کریم کے

لئے مقرر کرلیا، تو جب وہ وقت آئے تو فوراً جلدی سے قرآن شریف لے کر بیٹھ جاؤ، اگر اس وقت نیند آرہی ہو، سستی ہو رہی ہو، تو اپنے آپ سے کہہ دو کہ چاہے نیند آئے، یا سستی ہو، میں تو اس وقت تلاوت کروں گا، اور یہ وقت اسی کام میں صرف کروں گا، جب چند روز اس طرح کرو گے تو طبیعت اس کی عادی ہو جائے گی۔ اسی طرح نماز ہو، روزہ ہو، تلاوت ہو، ذکر ہو، تسبیح ہو، وظیفے ہوں، یا دنیا بھر کے اور کام ہوں، وہ سب اسی اصول کے تحت آتے ہیں، کہیں اس سے تخلف نظر آئے گا۔ لہٰذا اپنے دل کی گھبراہٹ کے غلام مت بنو، میرے پاس لوگوں کے خطوط آتے ہیں کہ فلاں عمل کرتے وقت گھبراہٹ ہوتی ہے، ارے بھائی! اس گھبراہٹ کے کب تک غلام بنے رہو گے، جو کام کرنا ہے، وہ دل کے گھبرانے کے باوجود کر گزرو۔

صرف دو باتوں پر عمل کرلو

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ:

> ”وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ کسی طاعت کی انجام دہی میں اگر سستی ہو تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے، اور جب کسی گناہ سے بچنے میں سستی ہو تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، سارے تصوف کا حاصل یہی ہے“

اپنے آپ سے مقابلہ کرنا ہوگا، لڑائی لڑنی ہوگی، لہٰذا اپنے نفس سے لڑے، شیطان سے لڑے، اور اپنے اوپر زبردستی کرے، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں، یہ محنت تو کرنی پڑے گی، اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا آمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ

(العنکبوت:۲)

”کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو چھوڑ دیں گے صرف ان کے ایمان لانے پر، اور ان کو آزمایا نہیں جائے گا“

یہ سب آزمائشیں ہیں، بہر حال نظام الاوقات بناؤ، اور پھر اس کی پابندی کرو، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

سستی کے غلام کب تک رہو گے

ہم لوگوں میں سے اکثر کا تو حال یہ ہے کہ ”نظام الاوقات“ ہی بنا ہوا نہیں ہے، الا ماشاء اللہ، بس جو کام سامنے آیا، وہ کر لیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، جس کام میں زیادہ وقت لگانا چاہیے تھا، اس میں کم وقت لگا دیا، اور جس کام میں کم وقت لگانا تھا، اس میں زیادہ وقت لگا دیا۔ لہٰذا اولاً تو نظام الاوقات ہی بنا ہوا نہیں، اور اگر کسی بندے نے نظام الاوقات بنا لیا ہے تو اب اس کی پابندی نہیں ہے، اور پابندی نہ ہونے پر عذر یہ ہے کہ دل نہیں لگتا، گھبراہٹ ہوتی ہے، سستی آجاتی ہے۔ ارے بھائی کب تک سستی کے غلام بنے رہو گے؟ جب موت آکر دروازے پر دستک دے گی، اس وقت پتہ چلے گا کہ کس کے غلام بنے ہوئے تھے، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ:

اِغْتَنِمْ حَیَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ (مشکاۃ، کتاب الرقاق، رقم: ۵۹۸۷)

مرنے سے پہلے زندگی کو غنیمت جان لو۔

فجر کے بعد دعا کر لو

ایک اور بات تجربہ کی بتاتا ہوں، وہ یہ کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اللہ

تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! یہ دن طلوع ہو رہا ہے، اور اب میں کارزار زندگی میں داخل ہونے والا ہوں، اے اللہ! اپنے فضل و کرم سے اس دن کے لمحات کو صحیح مصرف پر خرچ کرنے کی توفیق عطا فرما، کہ کہیں وقت ضائع نہ ہو جائے، کسی نہ کسی خیر کے کام میں صرف ہو جائے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھا کرتے تھے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَقَالَنَا یَوْمَنَا هٰذَا وَ لَمْ یُهْلِکْنَا بِذُنُوْبِنَا

یعنی اس اللہ کا شکر ہے جس نے یہ دن ہمیں دوبارہ عطا فرما دیا، اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہمیں ہلاک نہیں کیا۔ ہر روز سورج نکلتے وقت یہ کلمات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تو اس کے مستحق تھے کہ یہ دن ہمیں نہ ملتا، اور اس دن سے پہلے ہی ہم اپنے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیئے جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ہلاک نہیں کیا، اور یہ دن دوبارہ عطا فرمایا۔ لہٰذا پہلے یہ احساس دل میں لائیں کہ یہ دن جو ہمیں ملا ہے، یہ ایک نعمت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں عطا فرمادی ہے، اس دعا کے ذریعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ ہر دن کی قدر اس طرح کرو جیسے ہم سب رات کے وقت ہلاک ہونے والے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے زندگی دیدی، اب یہ جو نئی زندگی ملی ہے، وہ کسی صحیح مصرف میں استعمال ہو جائے۔

ان دعاؤں کا معمول بنالیں

حدیث شریف میں وہ دعائیں منقول ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ صبح کو فجر کے بعد پڑھا کرتے تھے، ہم سب بھی نماز فجر کے بعد اس

کے پڑھنے کا معمول بنالیں، وہ دعائیں یہ ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ وَخَيْرَ مَا بَعْدَهٗ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ هٰذَا الْيَوْمِ (ترمذی،ابواب الدعوات،باب ماجاء فی الدعاء اذا اصبح)

اے اللہ! میں آپ سے آج کے دن کی خیر طلب کرتا ہوں، اور اس کے بعد کی خیر طلب کرتا ہوں، اور اس دن کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

اور یہ دعا پڑھتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ وَفَتْحَهٗ وَنَصْرَهٗ وَنُوْرَهٗ وَبَرَكَتَهٗ وَ عَافِيَتَهٗ وَهُدَاهُ (ابو داؤد، کتاب الادب، باب مایقول اذا اصبح حدیث نمبر ۵۰۹۲)

اے اللہ! میں آپ سے آج کے دن کی خیر طلب کرتا ہوں، اور اس دن کی کامیابی، نصرت، نور، برکت، عافیت اور ہدایت طلب کرتا ہوں۔

اور یہ پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ هٰذَا النَّهَارِ صَلَاحًا، وَاَوْسَطَهٗ فَلَاحًا، وَ آخِرَهٗ نَجَاحًا

اے اللہ! آج کے دن کے ابتدائی حصہ کو میرے لئے صلاح بنا دیجئے، اور اس کے درمیانی حصہ کو فلاح، اور آخری حصہ کو میابی بنا دیجئے۔

یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری دعائیں ہیں، ان کو یاد کرلیں، اور روزانہ صبح کے وقت ان کو پڑھا کریں، اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں کہ: اے اللہ! اس دن کے ایک ایک لمحے کو اپنی رضا کے مطابق صرف کرنے کی توفیق عطا فرما۔ بہرحال! پہلے نظم الاوقات بناؤ، اور پھر اس بات کا عزم کرو کہ میں اس کی پابندی کروں گا، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اور توفیق مانگو، اس کے بعد کارزار زندگی میں داخل ہو جاؤ۔

رات کو سوتے وقت دن کا جائزہ

پھر رات کو سوتے وقت اپنا دن بھر کا جائزہ لے لو کہ آج صبح میں نے جو ارادہ کیا تھا، اس پر کس حد تک قائم رہا، اور کہاں کہاں بھٹک گیا، جہاں بھٹک گئے تھے، اس کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کر کے دوبارہ اپنے عزم کو تازہ کرلو، اور جس حد تک قائم رہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، ساری عمر یہی کام کرتے رہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بیڑہ پار کردیں گے۔

شام کا انتظار مت کرو

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ ، وَاِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ ، وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ

یعنی جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار مت کرو، اور جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار مت کرو، اس لئے کہ کچھ پتہ نہیں کہ کب موت آجائے، اور اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو، یعنی یہ سمجھو کہ میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔

اگر یہ آپ کی زندگی کا آخری دن ہو تو

لوگوں کو بھی عجیب طرح کے شوق ہوتے ہیں، ایک صاحب کو یہ شوق ہوا کہ اپنے زمانے کے جتنے بزرگ ہیں، ان کے پاس جاؤں، اور ان سے یہ سوال کروں کہ اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ کل آپ کا انتقال ہونے والا ہے، اور زندگی کا صرف ایک دن باقی ہے، تو اس ایک دن میں آپ کیا کریں گے؟ اس شخص کا مقصد یہ تھا کہ میں جب مختلف اللہ والوں کے پاس جا کر یہ سوال کروں گا تو ظاہر ہے کہ وہ لوگ جواب میں وہی عمل بتائیں گے جو ان کے

نزدیک سب سے زیادہ قابل اجر وثواب ہوگا، اور باعث نجات ہوگا۔ بہرحال! مختلف لوگوں کے پاس یہ سوال لے کر گئے، اسی دوران ایک مشہور محدث حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی گئے، اوران سے بھی یہ سوال کیا کہ اگر آپ کو پتہ چل جائے کہ کل آپ کا انتقال ہونے والا ہے، تو اس دن میں آپ کیا عمل کریں گے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں وہی عمل کروں گا جو روزانہ کرتا ہوں، اس میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتا، اس لئے کہ میں نے اپنا نظام الاوقات ہی ایسا بنایا ہوا ہے کہ گویا میرا ہر دن آخری دن ہے، صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کو میں نے اس طرح ڈھال لیا ہے کہ گویا کہ جو کام مجھے زندگی کے آخری دن میں کرنے چاہئیں، وہ میں آج کررہا ہوں۔

ہم ٹائم ٹیبل پر کیسے عمل کرسکتے ہیں؟

ایک صاحب نے یہ اشکال پیش کیا کہ ''نظام الاوقات'' بنا کر اس پر عمل کرنا آپ جیسے حضرات کے لئے تو ممکن ہے، جن کی بات سب مانتے ہوں، اور جو وقت آپ نے مقرر کرلیا ہے تو اب لوگ اس کی رعایت کرتے ہیں، اور کوئی شخص آکر آپ کو آپ کے معمول کے خلاف کسی اور کام میں لگانا چاہے تو نہیں لگا سکتا۔ اس لئے آپ کے لئے تو نظام الاوقات بنانا ٹھیک ہے۔ لیکن ہم جیسے عام آدمی کا یہ حال ہے کہ اگر اس نے ایک نظام الاوقات بنایا، کل کو کسی بڑے کا کوئی حکم آگیا کہ اس وقت میں تم فلاں کام کرو، ایسا شخص کیا کرے؟ پھر آپ کے پاس تو نوکر چاکر ہیں، خدمت کرنے والے بھی ہیں، دوسروں کے پاس تو نوکر چاکر نہیں، اب اگر گھر میں اچانک کوئی بیماری کھڑی ہوگئی، اس کی وجہ سے دوا لانے کے لئے جانا پڑا، یا کوئی بچہ بیماری ہوگیا تو ایسا شخص اپنے

نظام الاوقات کی پابندی کیسے کرسکتا ہے؟

ٹائم ٹیبل کی خلاف ورزی کی کب گنجائش ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ یہ جو میں نے کہا کہ آدمی نظام الاوقات بنا کر اس کی پابندی کرے، چاہے کچھ بھی ہو جائے، اس کا مطلب یہ تھا کہ سستی کی وجہ سے، یا کاہلی کی وجہ سے، یا دل گھبرانے کی وجہ سے اپنے معمول کو ترک نہ کرے۔ یہ جو میں نے کہا تھا کہ "کچھ بھی ہو جائے، نظام الاوقات پر عمل کرے" اس کا مطلب یہ ہے کہ چاہے دل پر آرے چل جائیں، مشقت معلوم ہو، یا محنت معلوم ہو، یا دل گھبرانے لگے تو اس گھبراہٹ، سستی، کاہلی اور مشقت کی وجہ سے اپنے نظام الاوقات کو نہ چھوڑے، لیکن اگر کوئی ایسی بات پیش آگئی جو عذر شرعی ہے، یا جو وقت کا تقاضا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے تو اس کی بناء پر نظام الاوقات کے خلاف کرنے سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی، اس لئے کہ نظام الاوقات کا اصل مقصد یہ ہے کہ زندگی کے اوقات صحیح مصرف پر خرچ ہوں، اور یہ اوقاتِ زندگی ایسے کام میں صرف ہوں جس میں یا تو دنیا کا فائدہ ہو، یا دین کا فائدہ ہو، فضول وقت ضائع نہ ہو۔

اس وقت تلاوت چھوڑ دو

مثلاً فرض کریں کہ آپ نے نظام الاوقات تو یہ بنایا تھا کہ فلاں وقت میں قرآن کریم کی تلاوت کروں گا۔ لیکن گھر میں کوئی بیماری کھڑی ہوگئی، اور اس بیماری کی وجہ سے آپ کو فوراً ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا، اور تلاوتِ قرآن کریم کا معمول چھوٹ گیا۔ لیکن اس کے بدلے میں ایک اور ثواب کا کام آگیا، وہ ہے اپنے گھر والوں کی تیمارداری، اور ان کا علاج، یہ بھی اپنے فرائض میں داخل

ہے، بلکہ ایک لحاظ سے تلاوت سے بھی افضل ہے، کیونکہ تلاوت نفل ہے، اور اپنے گھر والوں کا خیال رکھنا فرض ہے، اور فرض میں مشغول ہونا نفل میں مشغول ہونے سے افضل ہے، اس وجہ سے وہ معمول چھوٹنے سے کوئی خرابی لازم نہیں آئی، بلکہ اس جگہ پر اس سے بہتر عمل آ گیا، اور اس پر اجر و ثواب بھی ملا، لہٰذا اوقاتِ زندگی ضائع نہ ہوئے، بلکہ وہ کام میں لگ گئے۔

''سستی'' عذر نہیں

البتہ اگر یہ ہو کہ تلاوت کا ایک وقت مقرر کیا ہوا تھا، اب اس وقت نیند آ رہی ہے، اور تلاوت میں دل نہیں لگ رہا ہے، اور اس کی وجہ سے تلاوت چھوڑ دی تو یہ ہے وہ صورت جس کے بارے میں میں نے عرض کیا کہ اپنے اوپر زبردستی کر کے، کاہلی اور سستی کو دبا کر اس وقت کو اسی معمول میں صرف کرو۔ البتہ اگر کسی بڑے کا حکم آ جائے تو چونکہ بڑے کا حکم تو ماننا ہے، اب اگر اس کی وجہ سے معمول چھوٹ جائے تو اور بات ہے، البتہ اس صورت میں بھی بڑے سے گزارش کی جا سکتی ہے کہ یہ میرے فلاں کام کا وقت ہے، اگر آپ کی طرف سے اجازت ہو، اور وقت میں گنجائش ہو تو پہلے میں معمول پورا کر لوں، بعد میں یہ کام کر لوں، اگر وقت میں گنجائش نہ ہو تو معمول کو چھوڑ کر پہلے وہ کام کر لوں، یہ بھی ثواب کا کام ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور معمول کی پابندی

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے، وہ ایک مرتبہ حضرت کے گھر تھانہ بھون تشریف لائے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے استاذ کے آنے پر اتنی خوشی ہوئی، اور

ان کا اتنا اکرام کیا کہ ایک وقت میں دسترخوان پر ۵۲ قسم کے کھانے تیار کرائے، جب کھانا کھانے سے فارغ ہوئے تو اپنے استاذ سے فرمایا کہ حضرت! میں نے یہ وقت ''بیان القرآن'' کی تالیف کے لئے مقرر کر رکھا ہے، اگر آپ کی طرف سے اجازت ہو تو کچھ دیر جا کر اپنا معمول پورا کرلوں، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہاں، بھائی ضرور جاؤ۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں تالیف کے کام کے لئے بیٹھ گیا، لیکن کام میں دل نہیں لگا، اس لئے کہ استاذ تشریف لائے ہوئے ہیں، ان کے پاس بیٹھنے کو دل چاہ رہا ہے، اس لئے دو تین سطریں لکھیں، تاکہ ناغہ کرنے کی بے برکتی نہ ہو، اور پھر استاذ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ارے بھائی! تم تو بہت جلدی آگئے؟ میں نے کہا کہ حضرت! کام میں دل ہی نہیں لگا، میں نے سوچا کہ ناغہ نہ ہو، معمول پورا ہو جائے، اس لئے دو تین سطر لکھ کر معمول پورا کرلیا، اور حاضر ہوگیا۔ وہ بڑے بھی ایسے ہی تھے، ایسے نہیں تھے کہ اس بات پر ناراض ہو جاتے، اور کہتے کہ لو ہم تو تمہارے پاس آئے، اور تم تصنیف کرنے جا رہے ہو؟ یہ کیا بدتمیزی ہے؟ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی کے استاذ تھے، اس لئے اجازت دیدی۔

اس وقت معمول ٹوٹنے کی پرواہ نہ کرو

اصل بات یہ ہے کہ سستی اور گھبراہٹ اور کاہلی کی وجہ سے معمول میں ناغہ نہ ہونے دو، ہاں اگر کسی اور کام کا حقیقی تقاضا پیدا ہو جائے، اور اس کی وجہ سے معمول ٹوٹے، تو ٹوٹ جائے، اس کی پرواہ نہ کرو، اس لئے کہ ہوسکتا ہے اس دوسرے کام پر اللہ تعالیٰ زیادہ اجر و ثواب عطا فرمادے۔

میری ایک الجھن

ہمارے حضرت عارفی قدس اللہ سرہٗ نے ایک مرتبہ میری اک بڑی الجھن چند لمحوں میں دور فرمادی۔ میں ''صحیح مسلم شریف'' کی شرح ''تکملہ فتح الملہم'' جس زمانے میں لکھ رہا تھا، اس وقت میں نے روزانہ دو گھنٹے اس کام کے لئے مقرر کیے ہوئے تھے، اور کتب خانے میں اوپر جا کر لکھا کرتا تھا۔ بعض اوقات میرے ساتھ یہ ہوتا کہ میں کتب خانے میں جا کر اپنی جگہ پر بیٹھا، اور کتابوں کا مطالعہ کیا، اور لکھنے کے لئے ذہن بنایا، اور ہاتھ میں قلم اٹھایا، اور ابھی دو سطریں لکھی تھیں کہ ایک صاحب پہنچ گئے، ''اسلام علیکم'' کہا، اور مصافحہ کیا، اور کوئی مسئلہ پیش کر دیا کہ یہ میرا مسئلہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مطالعہ کے بعد لکھنے کے لئے ذہن کو جو تیار کیا تھا، وہ سب ختم ہو گیا۔ بہر حال! ان صاحب کا مسئلہ حل کیا، اور ان کو رخصت کیا، پھر دوبارہ مطالعہ کر کے دوبارہ لکھنے کے لئے ذہن بنایا، اتنے میں دوسرے صاحب آگئے، اور ''السلام علیکم'' کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا، اور اپنا مسئلہ پیش کر دیا۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا، اس کے نتیجے میں ذہن میں بڑی الجھن اور پریشانی رہتی تھی۔

یہ تصنیف کس کے لئے لکھ رہے ہو؟

ایک دن میں نے حضرت عارف باللہ رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ حضرت میرے ساتھ یہ قصہ رہتا ہے، اور اس کی وجہ سے بڑی تکلیف اور کوفت ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے وقت ضائع ہو جاتا ہے، اور تصنیف کا کام نہیں ہوتا۔ حضرت والا نے فرمایا کہ: ارے بھائی! تم یہ جو تصنیف لکھ رہے ہو، یہ کس کے لئے لکھ رہے ہو؟ کیا اپنے مزے کے لئے اور لذت حاصل کرنے کے لئے لکھ

رہے ہو؟ یا اللہ کو راضی کرنے کے لئے لکھ رہے ہو؟ اگر مزے، لذت اور اپنی شہرت حاصل کرنے کے لئے یہ تصنیف لکھ رہے ہو تو پھر تو ملاقات کے لئے آنے والوں کی وجہ سے تمہیں بیشک تکلیف ہونی چاہیے، لیکن اس صورت میں اس تصنیف پر تمہیں اجر و ثواب کچھ نہیں ملے گا، اور اگر اللہ کو راضی کرنے کے لئے لکھ رہے ہو تو پھر اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ جو مہمان تمہارے پاس آیا ہے، معقول حد تک اس کا اکرام کرنا ہے، یہ اکرام کرنا بھی اللہ جل شانہ کی عبادت ہے، جس طرح تصنیف کرنا عبادت ہے، یہ بھی ثواب کا کام ہے، وہ بھی ثواب کا کام ہے، جب اللہ تعالیٰ نے ہی اس مہمان کو تمہارے پاس بھیج دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کو تمہارا تصنیف کا کام کرنا مطلوب نہیں، بلکہ اس وقت مطلوب یہ ہے کہ یہ آدمی ہم تمہارے پاس بھیج رہے ہیں، اس کا مسئلہ حل کرو، لہٰذا چونکہ اس مہمان کا آنا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس لئے اس پر راضی ہو جاؤ، اگرچہ تم نے اپنی طرف سے یہ تجویز کیا تھا کہ اس وقت جا کر تصنیف کروں گا، لیکن تم کیا، اور تمہاری تجویز کیا، اللہ تعالیٰ نے اس وقت دوسرا کام تمہارے ذمہ لگا دیا، لہٰذا اس سے دلگیر اور پریشان مت ہو، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ایک شعبہ ہے۔ اس جواب کے ذریعے حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے دماغ کا دروازہ ہی کھول دیا، اس کے بعد اگرچہ اب بھی کسی کے بے وقت آنے سے طبعی تکلیف تو ہوتی ہے، لیکن عقلی طور پر الحمد للہ اب اطمینان رہتا ہے کہ اس کے آنے سے کوئی نقصان نہیں ہے۔

دین نام ہے وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا

اس کے بعد حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عظیم بات ارشاد

فرمائی، فرمایا کہ دیکھو! ''دین'' نام ہے وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا کہ اس وقت دین کا مجھ سے کیا مطالبہ ہے؟ اس مطالبے کو پورا کرنے کا نام ''دین'' اور ''اتباع'' ہے، اپنا شوق پورا کرنے اور اپنی تجویز پر عمل کرنے کا نام دین نہیں، مثلاً یہ کہ میں نے اپنا ایک معمول بنالیا ہے، اب چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، اور وقت کا مطالبہ کچھ بھی ہو، لیکن میں اپنے معمول کو پورا کروں گا۔ یہ کوئی معقول بات نہیں۔

ایک نواب صاحب کا لطیفہ

ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک نواب صاحب تھے، انہوں نے ہر کام کا ایک ضابطہ مقرر کر رکھا تھا، اور ان کا نظام الاوقات بھی ایک ضابطہ تھا کہ فلاں وقت سے لے کر فلاں وقت تک ہم سوئیں گے، فلاں وقت سے فلاں وقت تک ہم ناشتہ کریں گے، فلاں وقت سے فلاں وقت تک ہم چہل قدمی کریں گے۔ اب انہوں نے ضابطہ یہ مقرر کر دیا کہ رات کو گیارہ بجے ہم سوئیں گے، اور صبح چھ بجے تک سوئیں گے، اب اگر نہیں بھی سو رہے ہوتے تو ان کا کہنا تھا کہ میں ''ضابطے'' میں سو رہا ہوں، اگر صبح چھ بجے سے پہلے آنکھ کھل گئی تو لیٹے ہوئے ہیں، اور ضابطے میں سو رہے ہیں۔ ایک دن صبح پانچ بجے آنکھ کھل گئی تو انہوں نے دیکھا کہ ایک بندر کمرے میں آیا، اور ان کی ٹوپی لے کر بھاگ گیا، دوبارہ بندر آیا، اور ان کی لاٹھی اٹھا کر لے گیا، پھر آکر دوسرا کوئی سامان لے گیا، جب چھ بجے تو فوراً اٹھے اور شور مچانا شروع کر دیا کہ سب مر گئے ہیں، دیکھو بندر ہمارا سامان لے جا رہا ہے، اب ملازموں پر برسنا شروع کر دیا کہ سب بے پرواہ ہیں۔ اب ملازمین دوڑے

ہوئے آئے، اور پوچھا کہ حضور بندر آپ کا سامان لے گیا؟ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ بندر لے گیا، کیا آپ نے اس کو دیکھا؟ ہاں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے لے جاتے ہوئے دیکھا، ملازمین نے کہا کہ حضور آپ نے اس کو کیوں نہیں روکا؟ نواب صاحب نے جواب دیا، ارے بے وقوف! اس وقت ضابطے میں ہم سو رہے تھے، لہٰذا جب ہم سو رہے تھے تو ہم اس کو کیسے روکتے۔ بہر حال! ایسا ضابطہ کہ آدمی وقت کے تقاضے کو چھوڑ کر ضابطے ہی کے چکر میں پڑا رہے، یہ دین کا تقاضا نہیں، اگر تم نے ایک وقت کو کسی خاص کام کے لئے مقرر کیا ہوا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقت کا تقاضا کوئی اور آ گیا تو اب اس تقاضے کو پورا کرنا ضروری ہے۔

کام کی اہمیت یا وقت کا تقاضا

یہ بڑی اہم بات ہے، اور سمجھنے کی بات ہے، اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دین کی تعبیر میں، دین کی تشریح میں، اور دین پر عمل کرنے میں بہت گھپلا واقع ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب دل پر کسی خاص کام کی اہمیت سوار ہو جاتی ہے کہ یہ کام کرنا ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وقت کا تقاضا کسی اور کام کے کرنے کا ہوتا ہے، تو اب اس شخص کو اس وقت کے تقاضے کی پرواہ نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک مولانا صاحب ہیں، ان کو سبق پڑھانا ہے، اور اس کے لئے مطالعہ کرنا ہے وغیرہ، ان کاموں کی اہمیت تو ان کے دل میں ہے، لیکن میرے گھر والوں کے بھی کچھ حقوق میرے ذمہ ہیں، اور مجھے کچھ وقت ان کو بھی دینا چاہیے، اس کی طرف مولانا صاحب کو دھیان نہیں، حالانکہ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت کو آپ گھر والوں کے لئے استعمال کریں۔

بیوی کی تیمارداری، یا چلّہ میں جانا

یا مثلاً ہمارے تبلیغی بھائی ہیں، ان میں بسا اوقات یہ غلو پیدا ہو جاتا ہے کہ بیوی گھر میں بیمار پڑی تھی، ہم اس کو بیمار چھوڑ کر چلّے میں چلے گئے، اس لئے کہ اللہ کے راستے میں نکل گئے۔ ارے بھائی! اس وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کی خبر گیری کرتے، اس کی بیمار پرسی کرتے، ایسے وقت میں تبلیغ کے لئے جانے میں کوئی ثواب نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نوجوان آیا، اور کہا کہ یا رسول اللہ! میں اس لئے آیا ہوں کہ مجھے آپ کے ساتھ جہاد میں جانے کا شوق ہے، اور اس غرض کے لئے میں اپنے والدین کو روتا چھوڑ کر آیا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ واپس جاؤ، اور جا کر ان کو ہنساؤ، اس لئے کہ ان کو رلا کر جہاد میں شریک ہونے کی کوئی فضیلت نہیں۔

نماز حرم شریف میں یا مسجد شہداء میں

بہر حال! یہ جو وقت کے تقاضے ہیں، ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ کس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہے، جو حضرات عمرہ یا حج پر مکہ مکرمہ جاتے ہیں تو وہاں بھی تبلیغی بھائی ان کے پاس پہنچ جاتے ہیں، اور ان سے کہتے ہیں کہ حرم شریف میں نماز پڑھنے پر تو ایک لاکھ کا ثواب ملے گا، اور مسجد شہداء جو تبلیغی مرکز ہے، وہاں نماز پڑھنے پر انچاس کروڑ کا ثواب ملے گا۔ یہ بدفہمی کی بات ہے، اس لئے کہ ایک شخص یہاں سے حج کرنے کے لئے یا عمرہ کرنے کے لئے گیا تو اس نے اپنی زندگی کی مصروفیات میں سے یہ وقت حرم میں نماز پڑھنے اور طواف کرنے کے لئے نکالا ہے تو اب اس کو اس وقت یہ کام کرنے دو، اب اس کو حرم

سے نکال کر مسجد شہداء لے جانا معقول بات نہیں، کیونکہ یہ عمل وقت کے تقاضے کے خلاف ہے، اس لئے کہ اس کے پاس تبلیغ کے لئے ساری عمر پڑی ہے، اور یہ کام اپنے ملک اور اپنے شہر میں آکر بھی کرسکتا ہے، لیکن حرم میں نماز پڑھنے اور طواف کرنے کی فضیلت تو اپنے شہر میں حاصل نہیں ہوسکتی۔

شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں

اب رمضان میں اعتکاف کا زمانہ آرہا ہے، اب سننے میں یہ آیا ہے کہ بعض تبلیغی بھائی اعتکاف کرنے والوں سے یہ کہتے ہیں کہ اعتکاف کرنے میں اتنا ثواب نہیں، باہر جاکر تبلیغ کرنے میں زیادہ ثواب ہے۔ حالانکہ اعتکاف پورے سال کے دوران صرف دس دن ہوتا ہے، اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت اس پر عمل کیا جائے، اب اعتکاف چھڑوا کر تبلیغ کی دعوت دینا غلو ہے، اس لئے کہ اس کام کے لئے سال کے باقی دن موجود ہیں۔ اسی لئے ہمارے حضرت عارف باللہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ”دین نام ہے وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا“ اور میرے دوسرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ”دین نام ہے اتباع کا، اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں“ مثلاً ہمیں جہاد میں جانے کا شوق پیدا ہوگیا، یا تبلیغ کرنے کا شوق پیدا ہوگیا، تدریس کا شوق پیدا ہوگیا، یا تصنیف کرنے کا شوق ہوگیا، اب اپنے شوق کو پورا کررہے ہیں، اور یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ وقت کا تقاضا کیا ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ کا ہم سے مطالبہ کیا ہے؟ یہ بڑا اہم نکتہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ بات ہمارے دلوں اور دماغوں میں بٹھادے، آمین۔

ہر صدمہ اللہ کی طرف سے ہے

لہٰذا اگر اپنے بنائے ہوئے نظام الاوقات میں اور اپنے معمولات میں کوئی خلل وقت کے کسی جائز تقاضے کی وجہ سے واقع ہو تو اس پر رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے، اور نہ ہی مایوس ہونا چاہیے، نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی وجہ سے ہمارا نقصان ہوگیا، بلکہ اس کے نتیجے میں بعض اوقات ڈبل فائدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جس عمل کی وجہ سے نظام الاوقات میں خلل واقع ہوا، بعض اوقات وہ عمل زیادہ افضل ہوتا ہے، اور پھر معمول ٹوٹنے کا طبعی صدمہ اور طبعی غم ہوتا ہے، اگرچہ عقلی طور پر اطمینان رہتا ہے، اور ہر رنج اور ہر صدمہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب کا وعدہ ہے، اس لئے کہ اس دنیا میں ایک مؤمن کو کوئی رنج نہیں پہنچتا مگر اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں یا تو اس کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں، یا اس کے درجات بلند فرماتے ہیں۔

سستی سے بچو

ہاں! جو چیز بچنے کی ہے، جس سے مکمل احتراز اور پرہیز لازم ہے، وہ یہ کہ سستی کی وجہ سے، کاہلی کی وجہ سے، اور اس وجہ سے کہ کام میں دل نہیں لگ رہا ہے، یا اس وجہ سے کہ دل گھبرا رہا ہے، ان وجوہات کی وجہ سے اپنا نظام الاوقات توڑنا یا معمول چھوڑنا خطرناک بات ہے، اور جو شخص ان وجوہات سے اپنا نظام الاوقات توڑے گا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کامیابی حاصل کرنے والے کو تو سستی سے لڑنا پڑے گا، اپنی کاہلی سے بھی لڑنا پڑے گا، دل کی گھبراہٹ کو بھی برداشت کرنا پڑے گا۔

صحابہ کرام کا طرزِ عمل

اپنے اس طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بعض مرتبہ لوگ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی قربانیوں کا حوالہ دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جب تک قربانی نہیں دیں گے اس وقت تک دین کا غلبہ نہیں ہوتا، اور دین کے اندر اعلیٰ مقام حاصل نہیں ہوتا، اس کے بارے میں صحابہ کرام کی مثالیں موجود ہیں، جیسے حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آج ہی شادی ہوئی، اور نئی بیوی گھر میں موجود ہے، اور اگلے دن جہاد میں جانے کا اعلان ہو گیا تو ابھی یہ غسل جنابت بھی نہ کر پائے تھے کہ جہاد میں شامل ہو گئے۔ اب وقت کا تقاضا تو یہ لگتا ہے کہ ابھی گھر میں نئی بیوی آئی ہے، اس کے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے، لیکن یہ صحابی اس بیوی کو چھوڑ کر جہاد میں چلے گئے۔

یہ قیاس درست نہیں

خوب سمجھ لیجئے! دو باتیں الگ الگ ہیں، جن کو صحابہ کرام کی مثالوں میں ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے، ایک یہ کہ بعض اوقات حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے اپنے گھر والوں کو ایسے موقع پر چھوڑا جب کہ گھر سے نکلنا فرض عین ہو گیا تھا۔ مثلاً دشمن حملہ آور ہو گیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نفیر عام آگئی کہ ہر شخص جہاد میں نکل جائے، اب ہر شخص پر فرض عین ہے کہ وہ جہاد میں حصہ لے، اس صورت میں نہ والدین کی اجازت کی ضرورت ہے، نہ بیوی کی اجازت کی ضرورت ہے، یہاں تک فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نکل سکتی ہے، اور غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکل سکتا ہے، یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے، جبکہ

دشمن حملہ آور ہو گیا، اس وقت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ جہاد میں جاتے۔ اب اس واقعہ کو اس بات پر چسپاں کرنا کسی طرح مناسب نہیں جہاں پر نکلنا فرض عین نہیں، اسی طرح اس واقعہ کی بنیاد پر یہ کہنا کہ قربانی کے بغیر کام نہیں چلے گا، یہ زیادتی ہے، کسی طرح بھی درست نہیں۔

کسی کا حق ضائع نہیں کیا

دوسری طرف وہ مثالیں ہیں جن میں کسی صحابی نے اپنی ذات پر مشقت برداشت کر کے جہاد کیا، یا تبلیغ میں نکلے، دعوت میں نکلے، لیکن دوسرے کسی صاحب حق کا حق ضائع نہیں کیا۔

یہ کام ہر ایک پر فرض نہیں

تیسری طرف بعض صحابہ کرام کے افعال ایسے ہیں، جو بہت اعلیٰ درجے کے مقام کے ہیں، ہمیں بیشک اس بات کی کوشش تو کرنی چاہیے کہ اس مقام کا تھوڑا سا حصہ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ عطا فرما دے، لیکن ہر آدمی پر فرض نہیں کہ اس سے مطالبہ کیا جائے کہ تم ایسا ضرور کرو۔ مثلاً حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، نماز کے دوران ایک پرندہ باغ کے اندر آ گیا، اور اب وہ پرندہ باغ سے نکلنا چاہتا تھا، مگر باغ کے گنجان ہونے کی وجہ سے اس کو باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا، اب نماز کے دوران ان کا خیال باغ کی طرف چلا گیا کہ میرا باغ کتنا گنجان ہے کہ اس میں پرندے کو داخل ہونے کے بعد اس کو باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے، جب نماز ختم کی تو انہوں نے سوچا کہ یہ تو بڑا غلط کام ہوا کہ نماز کے دوران میرا دل اپنے باغ کی وسعت کی طرف لگ گیا، جس کی وجہ سے نماز کی خشوع کا حق ادا نہ ہوا، اور اس

باغ کی وجہ سے میرا دھیان بھٹکا، اس لئے میں اس باغ کو صدقہ کرتا ہوں۔

یہ دین کی صحیح تشریح نہیں

اب اگر یہ کہا جائے کہ جو کام حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا، یہ کام ہر مسلمان پر فرض ہے، اگر ایک منٹ کے لئے بھی نماز میں دھیان کہیں اور جائے تو یہ گناہ ہے، اور جس چیز کی طرف دھیان گیا، اس چیز کو صدقہ کرنا واجب ہے۔ اگر اس واقعہ سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے تو دین کی صحیح تشریح نہیں ہوگی، یہ تو ان کا اعلیٰ مقام تھا کہ انہوں نے ایک لمحہ کے لئے ذکر سے اور اللہ سے غافل ہونے پر اپنے لئے اتنی بڑی سزا مقرر فرمائی، لہٰذا یہ واقعہ لوگوں کو اس غرض کے لئے تو سنایا جائے کہ صحابہ کرام کے بلند مقام کو دیکھو کہ انہوں نے نماز میں خشوع ہونے کو کتنا اہم قرار دیا، جب وہ خشوع کو اتنا اہم سمجھتے تھے تو ہم بھی تو کچھ کریں، اس مقصد کے لئے تو یہ واقعہ بیان کرنا درست ہے۔ لیکن یہ واقعہ بیان کر کے یہ کہنا کہ ایسا کرنا ہر مسلمان پر فرض و واجب ہے، یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں، اور یہ دین کی صحیح تشریح نہیں ہوگی۔

دین کا ہر کام وقت کے تقاضے کے تابع ہے

لہٰذا چاہے درس و تدریس ہو، چاہے وعظ و تبلیغ ہو، چاہے جہاد ہو، یہ سب کام وقت کے تقاضوں کے تابع ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کیا تقاضا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہے؟ غزوہ تبوک کا موقع ہے، ہر شخص آگے بڑھ کر جہاد میں حصہ لے رہا ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صحابہ کرام کو ترغیب دی جارہی ہے، یہ ترغیب سن کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں بھی جہاد

میں جانے کا شوق پیدا ہو رہا ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا کہ تم جہاد میں مت جاؤ، بلکہ عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے مدینہ منورہ میں رک جاؤ، اب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بہادری میں، شجاعت میں، جرأت میں بہت سے صحابہ کرام سے زیادہ تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ یا رسول اللہ میں یہاں عورتوں اور بچوں کے پاس رہ جاؤں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے پیچھے مدینہ منورہ میں اس طرح رہو جیسے حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے رہے، اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینے میں رہنے کی ترغیب دی، اس لئے کہ ان کے لئے وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مدینے میں رہ کر عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال کریں، اور جہاد کو قربان کر دیں۔

حضرت عثمان غنیؓ کو غزوہ بدر سے روک دیا گیا

غزوہ بدر کا موقع ہے، وہ بدر جس کو قرآن کریم نے "یوم الفرقان" فرمایا، جس غزوہ میں شامل ہونے والا شخص بدری کہلایا، جن کے نام پڑھ کر لوگ دعائیں کرتے ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں، وہ بھی اس غزوہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں، لیکن ان کی بیوی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں، وہ بیمار ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ان کی تیمارداری کے لئے رک جاؤ، اور جہاد میں مت جاؤ۔ اب دیکھئے! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیوی کی تیمارداری کے لئے جہاد سے روک

دیا، اور غزوہ بدر جیسی عظیم فضیلت سے بظاہر ان کو محروم کر دیا۔ لیکن حقیقت میں وہ محروم نہیں ہوئے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "بدریین" میں شمار فرمایا، اور مال غنیمت میں ان کا حصہ لگایا۔

کس وقت کیا مطالبہ ہے

بہر حال! عرض یہ کرنا تھا کہ یہ دین کا بڑا اہم نکتہ اور بڑا اہم باب ہے کہ کس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہے؟ اور اس مطالبے پر مجھے کس طرح عمل کرنا ہے؟ دین کی یہ فہم عام طور پر بزرگوں کی صحبت کے بغیر پیدا نہیں ہوتی، بلکہ آدمی اپنے دماغ سے اجتہاد ہی کرتا رہتا ہے کہ اس وقت مجھے دین کا یہ تقاضا معلوم ہو رہا ہے۔

عمل پابندی سے کرو

خلاصہ یہ نکلا کہ نظام الاوقات کی پابندی بڑی اچھی چیز ہے، اس کے بغیر آدمی کے اوقات صحیح مصرف پر خرچ نہیں ہوتے، عمر بے کار چلی جاتی ہے۔ لیکن جہاں نظام الاوقات کا ٹوٹنا کسی جائز وجہ سے ہو، یا وقت کے کسی اہم تقاضے کی بناء پر ہو تو اس پر کوئی غم اور افسوس نہیں کرنا چاہیے، اس لئے کہ مقصود تو عمر کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا تھا، ایک کام میں نہیں تو دوسرے کام میں ہو گیا۔ ہاں! سستی کاہلی اور دل کی گھبراہٹ کی وجہ سے معمول کو قضا کرنا برا ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خیر العمل ما دیم علیه و ان قل

یعنی بہترین عمل جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، وہ ہے جو پابندی سے کیا جائے، چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ نہیں کہ جب رمضان کا اخیر عشرہ آیا تو

ساری رات عبادت میں گزار دی، اور جب رمضان گیا تو فرض نماز بھی گئی، یہ صحیح طریقہ نہیں، اس میں برکت نہیں ہوتی، بلکہ برکت اس میں ہے کہ تھوڑا عمل کرو، لیکن پابندی کے ساتھ کرو، جس کام کے لئے جو وقت مقرر کیا ہے، جب وہ وقت آجائے تو وہ کام کرلو، چاہے دو منٹ کے لئے یا پانچ منٹ کے لئے کر لو، لیکن کرو ضرور۔

بہترین مثال

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ تھوڑا عمل جس کو پابندی سے کیا جائے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے پانی کا نلکا، اب اگر نلکے کو پریشر کے ساتھ کھولا جائے، اور اس کے نیچے ایک پتھر رکھ دیا جائے، اور ایک گھنٹے تک کھلا رکھنے کے بعد اس کو بند کر دیا جائے تو اس پتھر پر اس پانی گرنے کا کوئی اثر واقع نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس نلکے سے ایک ایک قطرہ پانی کا اس پتھر پر ٹپکاؤ، اور سال بھر تک وہ پانی ٹپکتا رہے تو وہ پانی پتھر میں سوراخ کر دے گا، حالانکہ پہلے والا پانی پریشر کے ساتھ نکل رہا تھا، لیکن اس نے پتھر میں کوئی اثر نہیں کیا، جبکہ ایک قطرہ پانی جس کا کوئی وزن نہیں تھا، لیکن وہ سال بھر پڑتا رہا تو اس نے پتھر میں سوراخ کر دیا۔ اسی طرح جو عمل تھوڑا ہو، لیکن پابندی کے ساتھ ہو، وہ اپنا اثر ضرور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

گناہ چھوڑ دو
عابد بن جاؤ گے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گناہ چھوڑ دو، عابد بن جاؤ گے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ،وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَ مَوْلَا نَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیراً۔۔۔ اما بعد فعن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال:قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ ، وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لَکَ تَکُنْ اَغْنَی النَّاسِ ، وَاَحْسِنْ اِلٰی جَارِکَ تَکُنْ مُسْلِمًا ، وَاَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ ،وَلَا تُکْثِرِ الضَّحِکَ فَاِنَّ کَثْرَۃَ الضَّحِکِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ ۔

(او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام)

تمہید

یہ ایک حدیث ہے، جس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرما رہے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، آپ نے فرمایا کہ میں پانچ باتیں کہتا ہوں، کون شخص ہے جو ان پانچ باتوں کو یاد رکھے، اور ان پر عمل کرے، اور یہ باتیں دوسروں کو بتا کر ان کو بھی ان پر عمل کرائے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: انا یا رسول اللہ ﷺ! میں ان پانچ باتوں کو یاد بھی رکھوں گا، اور عمل کرنے کی بھی کوشش کروں گا، اور دوسروں تک ان کو پہنچاؤں گا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلیوں پر گن کر یہ کلمات ارشاد فرمائے، ان میں سے ایک ایک کلمہ جوامع الکلم کے اندر شامل ہے، ہر جملہ اور ہر کلمہ اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادے تو ہمارا سارا معاملہ درست ہو جائے۔

عبادت گزار کیسے بنو گے؟

پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ "اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ" یعنی تم حرام کاموں سے بچو تو تم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ کے ذریعے یہ حقیقت واضح فرما دی کہ فرائض و واجبات کی تعمیل کے بعد سب سے زیادہ اہم چیز مؤمن کے لئے یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ناجائز و حرام کاموں سے بچائے، نفلی عبادتوں کا معاملہ اس کے بعد آتا ہے، اگر کوئی شخص اس دنیا میں اپنے آپ کو گناہوں سے بچالے تو ایسا شخص سب سے زیادہ عبادت گزار ہے، چاہے وہ نفلیں زیادہ نہ پڑھتا ہو۔

نفلی عبادات نجات کے لئے کافی نہیں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملے کے ذریعہ ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے، وہ یہ کہ ہم لوگ بسا اوقات نفلی عبادتوں کو تو بہت اہمیت دیتے ہیں، مثلاً نوافل پڑھنا، تسبیح، مناجات، تلاوت وغیرہ، حالانکہ ان میں کوئی ایک کام بھی ایسا نہیں جو فرض ہو، چاہے نفلی نمازیں ہوں، یا نفلی روزے ہوں، یا نفلی صدقات ہوں، ان کو تو ہم نے بڑی اہمیت دی ہوئی ہے، لیکن گناہوں سے بچنے کا اور ان کو ترک کرنے کا اہتمام نہیں، یاد رکھیں کہ یہ نفلی عبادات انسان کو نجات نہیں دلا سکتیں، جب تک انسان گناہوں کو نہ چھوڑے۔ اب رمضان المبارک کا مہینہ چل رہا ہے، اس ماہ مبارک میں لوگوں کی نفل عبادات کی طرف توجہ ہوتی ہے کہ عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ نفلیں پڑھ لیں، تلاوت زیادہ کرلیں، ذکر و تسبیح زیادہ کرلیں، یہ بھی اچھی بات ہے۔ لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ میں نفل عبادات تو کر رہا ہوں، ساتھ میں گناہ بھی تو کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے، ان کے اندر مبتلا ہو رہا ہوں، دونوں کا اگر موازنہ کریں تو یہ نظر آئے گا کہ نفلی عبادات سے جو فائدہ ہو رہا تھا، وہ گناہوں کے ذریعے نکل رہا ہے۔

گناہوں کی مثال

اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ نے اپنے کمرے کا ائیر کنڈیشن تو چلا دیا، لیکن دروازے اور کھڑکیاں کھلی پڑی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف سے ٹھنڈک آرہی ہے، اور دوسری طرف سے ٹھنڈک نکل رہی ہے، اور باہر کی گرمی بھی اندر آرہی ہے، اور اس کے نتیجے میں کمرہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا ہے، اور

ائیر کنڈیشن چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ اسی طرح آپ نے نفلوں کا ائیر کنڈیشن تو لگا لیا، ذکر اور تلاوت کا ائیر کنڈیشن تو لگا لیا، لیکن گناہوں کی کھڑکیاں چاروں طرف سے کھلی ہوئی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ان عبادات سے جو فائدہ حاصل ہونا چاہیے تھا، وہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

حلال کھانے کی فکر کرو

اب رمضان المبارک میں تراویح پڑھنے کا کتنا اہتمام ہم لوگ کر رہے ہیں، جو لوگ پنج وقتہ نمازوں میں کوتاہی کرتے ہیں، ان کو بھی رمضان میں تراویح کی لمبی لمبی بیس رکعتوں میں کھڑے ہونے میں کوئی تأمل نہیں ہوتا، اور رات کو سحری کے وقت تہجد بھی پڑھ لیتے ہیں، لہٰذا نفلی عبادات تو ہو رہی ہیں۔ لیکن اس شخص کو یہ فکر نہیں کہ جب شام کو افطار کرنے کے لئے دسترخوان پر بیٹھیں گے تو وہ کھانا حلال ہوگا یا حرام ہوگا؟ سارا دن روزہ رکھا، رات کو تراویح ادا کی، تہجد پڑھے، لیکن منہ میں جو لقمہ جا رہا ہے، وہ حلال کا ہے یا حرام کا ہے، اس کی فکر نہیں، اس حدیث کے ذریعے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ اصل فکر اس کی کرو کہ کوئی گناہ تم سے سرزد نہ ہو، اگر یہ کر لیا تو پھر چاہے نفلی عبادات تم نے زیادہ نہ کی ہوں، تو بھی تمام لوگوں میں تم سب سے زیادہ عبادت گزار لکھے جاؤ گے۔

دونوں میں سے کون افضل ہے؟

اس بات کو ایک مثال سے اور زیادہ واضح طریقے پر سمجھ لیں، فرض کریں کہ ایک شخص نفلی عبادات بھی کرتا ہے، ذکر میں تلاوت میں مشغول رہتا ہے، ہر وقت اس کی تسبیح چلتی رہتی ہے، لیکن ساتھ میں وہ گناہ بھی کرتا رہتا

ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس نے زندگی بھر ایک نفلی عبادت نہیں کی، لیکن زندگی بھر اس نے کوئی گناہ بھی نہیں کیا، بتاؤ! ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟ وہ شخص افضل ہے جس نے گناہوں سے بچتے ہوئے زندگی گزاری، اگرچہ نفلی عبادتوں میں اس کا کوئی خاص حصہ نہیں ہے، اس شخص سے آخرت میں یہ سوال نہیں ہوگا کہ تم نے نفلی عبادات کیوں نہیں کیں؟ کیونکہ نفلی عبادات فرض نہیں ہیں، لہٰذا انشاء اللہ وہ سیدھا جنت میں جائے گا۔ اس کے برخلاف پہلا شخص جو نفلی عبادات میں تو بہت مشغول رہا، لیکن ساتھ ساتھ گناہ بھی کرتا رہا، اور گناہ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں آخرت میں سوال ہوگا: مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال:۸) لہٰذا اس سے یہ سوال ہوگا کہ تو نفلی عبادات تو کرتا رہا، اور یہ گناہ کا کام بھی کرتا رہا، نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسا شخص بڑے خسارے میں ہوگا۔

دو عورتوں کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دو عورتوں کا ذکر کیا گیا، ایک عورت تو بہت عبادت میں مشغول رہتی ہے، نوافل بہت پڑھتی ہے، لیکن زبان کی خراب ہے، اور اپنی زبان سے لوگوں کو اور خاص کر اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ دوسری عورت صرف فرائض وواجبات پر اکتفا کرتی ہے، نفلی عبادات زیادہ نہیں کرتی، لیکن زبان کی بڑی میٹھی ہے، اور لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتی ہے، اس کی پڑوسنیں اس سے خوش ہیں، پھر آپ سے سوال کیا گیا کہ ان میں سے کون سی عورت افضل ہے؟ وہ عبادت گزار خاتون، یا یہ پرہیز گار خاتون؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دوسری خاتون پہلی خاتون

کے مقابلے میں بدر جہا فضیلت رکھتی ہے، بلکہ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ پہلی خاتون جہنمی ہے، اور دوسری خاتون جنتی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ وہ زبان سے دوسروں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔

زیادہ فکراس کی کریں

اس حدیث سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ نفلی عبادات بیشک اعلیٰ درجے کی نعمت ہے، ضرور ان کو انجام دینا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ زیادہ فکر اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی کرنی چاہیے۔ رمضان المبارک میں تو الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے روزے رکھے، تلاوت بھی خوب کی، تراویح بھی باجماعت ادا کی، تہجد بھی پڑھے، نوافل بھی پڑھیں، اعتکاف بھی کیا، لیکن ادھر رمضان رخصت ہوا، ادھر دوبارہ وہی پرانی زندگی شروع ہوگئی، اب نہ آنکھ کی حفاظت، نہ زبان کی حفاظت، نہ کان کی حفاظت، نہ حلال وحرام کی فکر، جس کا مطلب یہ ہوا کہ رمضان المبارک میں جو پونجی نیکیوں کی جمع کی تھی، وہ جا کر لٹا دی۔ لہذا فکر اس کی کرنی ہے کہ گناہوں سے بچ جائیں، اور گناہوں سے بچنے کا پکا عزم بھی کریں، اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے گناہوں سے بچنے کی توفیق کی دعا بھی کریں کہ یا اللہ! مجھے گناہوں سے بچنے کی توفیق بھی دیدے۔

یہ بڑی خطرناک بات ہے

یہ جو میں نے عرض کیا کہ ہمارے دلوں میں نفلی عبادات کی تو اہمیت ہے، لیکن گناہوں سے بچنے کی اہمیت اور فکر نہیں، یہ ایک ایسا مرض ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں، شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اس سے مستثنیٰ ہوگا۔ اس لئے کہ بعض گناہ تو ایسے ہیں، جن کو ہم گناہ سمجھتے ہیں، اور گناہ سمجھنے کی وجہ سے ان سے

نفرت بھی ہوتی ہے، ان سے اپنے آپ کو بچانے کی کچھ فکر بھی ہو جاتی ہے، الحمد للہ، لیکن کتنے گناہ ایسے ہیں جن کو گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا، یہ بڑی خطرناک بات ہے، کیونکہ انسان بیماری کو بیماری سمجھے گا تو اس کا علاج بھی کرے گا۔ خاص طور پر شریعت کے یہ تین شعبے، یعنی: معاملات، معاشرت اور اخلاقیات ایسے ہیں، جن پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہماری ساری کوششیں اکارت ہو رہی ہیں، معاملات میں حلال و حرام کی فکر، معاشرت میں حلال و حرام کی فکر، اخلاقیات میں حلال و حرام کی فکر مٹتی جا رہی ہے، اور ان کو ہم نے دین سے خارج کر دیا ہے، زبان کی حفاظت، آنکھ کی حفاظت، کان کی حفاظت کی طرف دھیان نہیں۔

بدگمانی کو چھوڑ و

چند موٹے موٹے گناہوں کے بارے میں تو ذہن میں یہ ہے کہ یہ گناہ ہیں، بس ان سے بچ جاؤ، الحمد للہ، ان سے بچے ہوئے ہیں، مثلاً اللہ کا شکر ہے کہ شراب نہیں پیتے، اللہ کے فضل و کرم سے خنزیر نہیں کھاتے، اللہ کے فضل و کرم سے زنا میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لیکن اور جو بے شمار گناہ ہیں، مثلاً غیبت کا گناہ ہے، اس سے ہم نہیں بچتے، دن رات ہماری مجلسیں غیبت سے بھری ہوئی ہیں۔ بدگمانی کا گناہ ہے، قرآن کریم میں ہے کہ "اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" لیکن ہم لوگ دوسرے آدمی کی طرف سے اپنے دل میں بدگمانی لئے بیٹھے ہیں، اور اس کو پکا رہے ہیں، لیکن ہم لوگ اس کو گناہ ہی نہیں سمجھتے، یہ بات ذہن میں لے کر بیٹھ گئے کہ فلاں شخص نے میرے خلاف یہ عمل کیا ہوگا، اور اب اس کو اپنے دماغ و دل میں پکا لیا، یہ ہمارا عمل "اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" میں داخل

ہو گیا، لیکن یہ احساس نہیں کہ یہ گناہ ہے۔

افواہ پھیلانا گناہ ہے

ایک بے تحقیق بات سنی، اور اس کی تحقیق کیے بغیر کہ وہ بات درست ہے یا نہیں، اس کو آگے چلتا کر دیا، اور اس کو کسی اور کے سامنے بیان کر دیا، یا افواہ پھیلا دی۔ اس عمل کو کوئی شخص بھی گناہ نہیں سمجھتا، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ

یعنی یہ بات بھی جھوٹ میں داخل ہے کہ انسان نے جو کچھ الٹا، سیدھا، صحیح، غلط سنا، اور بلا تحقیق اس کو آگے بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہ گناہ ہے، مگر ہم اس کو گناہ سمجھتے ہی نہیں۔

ملازمت کے اوقات پورے دے رہے ہو؟

لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہم حلال کھا رہے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ سود نہیں کھا رہے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ جوا نہیں کھیل رہے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ شراب بیچ کر پیسے نہیں کما رہے ہیں۔ لیکن ذرا یہ تو دیکھو کہ اگر تم ملازم ہو تو کیا ملازمت کا جو وقت مقرر تھا وہ پورا وقت ملازمت کے کام میں لگایا یا نہیں؟ یا ڈنڈی مار گئے، اگر پورا وقت نہیں لگایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنا وقت تم نے بیچا تھا، اور جس کے بدلے میں تمہیں تنخواہ مل رہی تھی، اس میں سے جتنا وقت تم نے ملازمت کے کام میں نہیں لگایا، اس کے بدلے میں جو تنخواہ تم نے وصول کی، وہ تنخواہ حرام ہو گئی، اور جب تنخواہ حرام ہو گئی تو اب ان پیسوں سے جو کھانا خریدا وہ کھانا حرام ہو گیا، اور جو افطاری کا سامان خریدا وہ حرام۔

لہٰذا یہ بھی حرام خوری میں داخل ہے۔

جاپانی کہہ کر مال فروخت کرنا

اگر کوئی شخص تاجر ہے، اور اس نے اس تجارت میں کسی قسم کا دانستہ یا نادانستہ دھوکہ کیا ہے، مثلاً پاکستان میں بنا ہوا مال تھا، اس کو جاپانی کہہ کر بیچ دیا تو حرام کیا، اور اس کے نتیجے میں جو پیسے حاصل ہوئے وہ حرام ہوئے، اور ان پیسوں سے جو کھانا خریدا وہ حرام، اب پیٹ میں حرام لقمہ جارہا ہے، حلال کا لقمہ نہیں جارہا ہے،

سٹہ کھیلنا حرام ہے

ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے جو بڑے عبادت گزار اور تہجد گزار تھے، ان کی تہجد میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا، اور ذکر واذکار اور تسبیحات کے پابند تھے۔ تاجر آدمی تھے، ان کی دکان بھی تھی، معلوم ہوا کہ وہ رات کو گھنٹوں تہجد بھی پڑھتے ہیں، تلاوت بھی کرتے ہیں، تسبیحات بھی پڑھتے ہیں، اور دن میں جاکر ''سٹہ'' بھی کھیلتے ہیں، اور وظیفے اس مقصد کے لئے پڑھتے ہیں تاکہ سٹے کا نمبر معلوم ہوجائے۔ یہ تو بالکل واضح گناہ ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ گناہ ہے۔

جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوانا

لیکن میں ان چیزوں کی طرف توجہ دلا رہا ہوں جن کے بارے میں یہ احساس بھی نہیں کہ میں یہ کوئی گناہ کا کام کر رہا ہوں۔ مثلاً جھوٹا سرٹیفکٹ بنوالینا آج عام ہوچکا ہے، چھٹی لینی ہے، اور ویسے نہیں مل سکتی، تو کسی ڈاکٹر سے جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوالیا، اور اس کی بنیاد پر چھٹی حاصل کرلی، اس کے نتیجے میں

خود بھی گناہ کیا، اور جس ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ بنوایا، اس کو بھی گناہ میں مبتلا کیا، کیونکہ اس ڈاکٹر نے جھوٹ بولا، اور رشوت بھی لی، اس لئے کہ للہ فی اللہ تو اس نے یہ کام کیا نہیں ہوگا، اس طرح اس ڈاکٹر نے رشوت لینے کا گناہ بھی کمایا، اور جھوٹ بولنے کا گناہ بھی کمایا، اور یہ صاحب اس گناہ کا سبب بنے۔ یہ سب گناہ تو ہوئے، اس کے علاوہ یہ کہ مہینے کے آخر میں جو تنخواہ ملی، اس تنخواہ میں سے اتنا حصہ حرام کا شامل ہوگیا۔

عبادت نام ہے بندگی کا

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اتق المحارم تکن اعبد الناس" یعنی عبادت گزاری یہ نہیں کہ آدمی رات کو خوب نفلیں اور تہجد پڑھ رہا ہے، بلکہ عبادت گزاری یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے انسان اپنے آپ کو محفوظ کر لے، اصلی عبادت گزاری یہ ہے، اس لئے کہ عبادت کے معنی ہیں بندگی، اور بندگی کا پہلا جز اللہ کے حکم کی اطاعت ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں تو وہ بندگی کیا ہوئی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ تو کر لیا، لیکن ساتھ میں یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کا حکم نہیں مانوں گا، میں وہی کروں گا جو میری مرضی میں آئے گا، یہ کیا بندگی ہوئی؟ لہٰذا اطاعت بندگی کا جزو اعظم ہے، اس لئے یہ فکر ہونی چاہیے کہ ہم کوئی کام اللہ جل شانہ کے حکم کے خلاف اور نافرمانی میں نہ کریں۔

زبان کی حفاظت کرو

خاص طور پر جو عرض کرنا ہے، اور جس میں عام ابتلاء رہتا ہے، ان میں سے ایک تو زبان کے گناہ ہیں، ایک آنکھ کے گناہ، ان دونوں گناہوں میں

اچھے اچھے لوگ مبتلا ہیں، جو لوگ بظاہر عابد و زاہد نظر آتے ہیں، متقی و پرہیزگار نظر آتے ہیں، وہ بھی اگر اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ وہ بھی زبان کے گناہ اور آنکھ کے گناہ میں مبتلا ہیں، لہٰذا یہ فکر ہونی چاہیے کہ ہماری زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکلے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا ہو۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض اوقات انسان اپنی زبان سے کوئی کلمہ بے پرواہی میں ایسا نکال دیتا ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں پہنچا دیتے ہیں۔ مثلاً اس نے کسی وقت کسی جذبے کے ساتھ اللہ جل شانہ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے ''الحمد للہ'' کہہ دیا، یا ''سبحان اللہ'' کہہ دیا، یا کوئی اور ذکر کر لیا، ایسے اخلاص اور جذبے کے ساتھ کیا کہ میرے مولیٰ نے اس کو قبول فرمالیا، اور اسی پر بیڑا پار کر دیا۔ یا زبان سے کوئی ایسا کلمہ کہا جس سے ٹوٹے دل کا علاج ہو گیا، اور اس کے دل کو تسلی ہو گئی، اب بظاہر تو تم نے اہتمام کر کے وہ کلمہ نہیں کہا تھا، لیکن چونکہ اس کے ذریعے ٹوٹے دل کی تسلی ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا، اس کی بدولت تمہارا بیڑہ پار کر دیا، اور جنت میں پہنچا دیا۔

زبان سے نکلنے والا ایک کلمہ

پھر آپ نے فرمایا کہ بعض اوقات انسان اپنی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکالتا ہے جس کو وہ کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا، لیکن اس ایک کلمہ کی بدولت وہ جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ کلمہ اس کو جہنم میں اتنی گہرائی میں پھینک دیتا ہے کہ جو ستر سال کی مسافت پر ہوتی ہے۔ مثلاً جھوٹ بول دیا، غیبت کر دی، کسی کا دل توڑ دیا، کسی کو برا بھلا کہہ دیا، جس کے نتیجے میں

اس کلمے نے اس کو ستر سال کی مسافت کی گہرائی میں پہنچادیا۔ جب ایک کلمہ اس حد تک گہرائی میں پہنچادیتا ہے تو یہ زبان جو ہر وقت صبح سے لے کر شام تک بے مہا با قینچی کی طرح چل رہی ہے، معلوم نہیں کہ جہنم کی کتنی گہرائی میں ہمیں ڈال دے۔

مجالس میں غیبت اور تنقید

ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسانوں کو اوندھے منہ جہنم میں گرانے والی کوئی چیز ''زبان'' سے زیادہ خطرناک نہیں۔ لیکن کیا ہمیں اس کی کچھ فکر ہے کہ اس زبان کو روکیں، اور اس کو قابو کرلیں، اور اس کو صرف اللہ جل شانہ کی مرضیات میں استعمال کریں، اور اللہ جل شانہ کی معصیتوں اور گناہوں میں اس کو استعمال نہ کریں۔ اگر مجلس میں بیٹھے ہیں تو غیبت ہورہی ہے، لیکن ہمیں کوئی پرواہ نہیں، اگر کسی سے گفتگو ہو رہی ہے، تو بعض لوگوں کو گفتگو کے دوران دوسروں پر تنقید کا بڑا شوق ہوتا ہے، اور اس تنقید کے نتیجے میں دوسروں کو ڈنگ مارتے ہیں، دوسروں کا دل توڑتے ہیں، لیکن اس شخص کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

پہلے تولو پھر بولو

ارے بھائی! جھوٹ ہو، غیبت ہو، بے تحقیق باتیں ہوں، ان سب سے بچو، خلاصہ یہ کہ زبان کو سوچ سوچ کر استعمال کرو، وہ جو بزرگوں نے فرمایا کہ ''پہلے تولو پھر بولو'' یہ نہ ہو زبان بے مہابہ چل رہی ہے، اور اس کی پرواہ نہیں ہے کہ میری زبان سے کیا نکل رہا ہے، اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس لئے سوچ کر بولو، اور جب کسی سے بات کرو تو ڈرتے ہوئے بات کرو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری زبان سے اس کو تکلیف پہنچ جائے، اور آخرت میں اللہ جل شانہ کے

پاس مجھے اس کا جواب دینا پڑے، اس کی فکر کرو۔ لہٰذا اپنی زبان کو، اپنی آنکھ کو، اپنے کانوں کو گناہوں سے بچاؤ، کیونکہ جس طرح غیبت کرنا ناجائز ہے، اسی طرح غیبت سننا بھی ناجائز ہے، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اتق المحارم تکن اعبد الناس'' حرام کاموں سے بچو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔

حقیقی مجاہد کون؟

نفلیں پڑھنا تو سب کو نظر آتا ہے، اور دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ بڑا عابد و زاہد آدمی ہے۔ لیکن گناہوں سے بچنا اور بچنے کی فکر کرنا ایسی چیز ہے، جو دوسروں کو پتہ بھی نہیں چلتی۔ مثلاً دل میں گناہ کا تقاضا ہوا، اور آدمی نے اس تقاضے کو دبادیا، اور اس تقاضے پر عمل نہیں کیا، یہ اتنا بڑا اجہاد ہے جس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَہٗ'' اتنا بڑا اجہاد کرلیا، اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا، اس میں کوئی شہرت بھی نہیں ہوتی، نہ اس میں ریاکاری کا احتمال ہے، بلکہ اپنے کو بچا کے رکھنے کی فکر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے اور آپ سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

رمضان المبارک کے روزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ
عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرة:۱۸۳)

اس آیت میں روزے کا مقصد یہ بیان فرمایا کہ تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو، اور گناہوں سے بچنے کی فکر کا نام ''تقویٰ'' ہے، لہٰذا اس ماہ رمضان میں یہ فکر پیدا کرنی ہے، اللہ تعالیٰ ان روزوں اور تراویح کی برکت سے یہ فکر

ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے، اور جب رمضان المبارک ختم ہو تو اس کے بعد بھی ہم اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے والے بن جائیں، اور یہ فکر پیدا ہو جائے کہ یہ گناہ کتنی مہلک چیز ہے، جس سے بچنا ضروری ہے، اگر آنکھ کی حفاظت، زبان کی حفاظت، کانوں کی حفاظت، دل کی حفاظت کرلیں، تو پھر دیکھیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کیسے انوار وبرکات نازل ہوتے ہیں۔

آنکھ، کان، زبان بند کرلو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نہ بینی نور حق، بر من بخند

مولانا فرماتے ہیں کہ اپنی آنکھ بند کرو، بند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اہتمام کرو کہ یہ آنکھ ناجائز جگہ پر نہ دیکھے، کانوں کو بند کرو، کانوں کو بند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی فکر کرو کہ یہ کان گناہ کی کوئی بات نہ سنے، جیسے گانا سننا، غیبت، جھوٹ نہ سنے، اور ہونٹوں کو بند کرو کہ کوئی غلط بات منہ سے نہ نکلے۔ یہ تین کام کرلو، یہ تین کام کرنے کے بعد اگر اللہ کا نور نظر نہ آئے تو مجھ پر ہنس دینا۔ یہ بات وہ شخص کہہ رہا ہے جس کی ساری زندگی اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں گزری، نورِ حق اس وقت نظر آتا ہے جب آدمی اپنے آپ کو ان گناہوں سے محفوظ کرلیتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس حدیث کے اس ارشاد پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

آج اس حدیث کے ایک جملے کا بیان ہوگیا، باقی کا بیان انشاء اللہ کل کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

قناعت اختیار کرو

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۶

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

''قناعت'' اختیار کرو

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ،وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ــ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَ مَوْلَا نَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً ــ اما بعدفقد قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم : وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لَکَ تَکُنْ اَغْنَی النَّاسِ۔

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ کل ایک حدیث کا بیان شروع کیا تھا، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کون ہے جو پانچ باتیں مجھ سے سیکھے، اور خود بھی عمل کرے، اور دوسروں تک ان باتوں کو پہنچائے، اور

عمل کرائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں، تو آپ نے یہ پانچ باتیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے بیان فرمادیں، جن میں سے پہلا جملہ وہ تھا جس کی تشریح میں نے کل عرض کی تھی، ''اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ'' یعنی تم حرام چیزوں سے بچو تو تم سارے لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان کے عبادت گزار ہونے کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ گناہوں سے پرہیز کرے، اور تقوی اختیار کرے، اگر گناہوں سے تو پرہیز نہیں کیا، اور نفلی عبادتیں خوب ہو رہی ہیں، تو محض نفلی عبادتوں کی کثرت سے انسان عبادت گزار نہیں بنتا، جب تک اس کے ساتھ ساتھ گناہوں کو بھی ترک نہ کرے، اس کی تھوڑی سے وضاحت اور تفصیل عرض کردی تھی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ظاہر کے گناہ، باطن کے گناہ، حقوق اللہ سے متعلق گناہ، معاشرت سے متعلق گناہ، اخلاق سے متعلق گناہ، اللہ تعالیٰ ان سب گناہوں سے نجات عطا فرمادے، آمین۔

قسمت کے لکھے ہوئے پر راضی ہو جاؤ

دوسرا فقرہ جو اس حدیث میں ارشاد فرمایا، وہ یہ ہے کہ:

وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لَکَ تَکُنْ اَغْنَی النَّاسِ

یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر راضی ہو جاؤ، اگر تم راضی ہو جاؤ گے تو تم دنیا کے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔ پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ ''غنی'' کا عام طور پر ترجمہ ''مالدار''

اور ''دولتمند'' سے کیا جاتا ہے، جس کے پاس دولت اور پیسہ زیادہ ہو، وہ غنی ہے، حقیقت میں ''غنی'' کے معنی ''دولتمند'' کے نہیں ہیں، بلکہ حقیقت میں ''غنی'' کے معنی ہیں ''وہ شخص جو کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو'' چونکہ جس شخص کے پاس دولت ہے، پیسہ ہے، امیر آدمی ہے، ایسا شخص کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی سے اس کو مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، اس وجہ سے اس کو ''غنی'' کہتے ہیں، ورنہ اصل میں ''غنی'' کے معنی ''مالداری'' کے نہیں، بلکہ اس کے اصل معنی ''حاجت سے بے نیاز'' ہونے کے ہیں کہ آدمی کو کسی دوسرے کی حاجت نہیں۔

غنی کون؟

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعَرَضِ، وَلٰکِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ

اصل میں ''غنی'' روپے، پیسے اور سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی، بلکہ اصل میں ''غنی''، نفس کا ''غنی'' ہے کہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تقدیر پر ''قناعت'' ہو جائے، اور اس صورت میں وہ دوسروں سے بے نیاز ہو جائے کہ بس جو مجھے مل گیا وہ ہی میرے لئے کافی ہے، انسان کے دل میں جب یہ خیال پیدا ہو جائے تو انسان ''غنی'' ہے۔ اس لئے کہ پیسہ بذاتِ خود تو کوئی چیز نہیں، کیا پیسوں کو بھوک کے وقت کھالو گے؟ نہیں۔ یا اس کو کپڑوں کی جگہ پہن لو گے؟ نہیں۔ بلکہ پیسوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو تنگ دستی نہ ہو، اس کی ضرورت پوری ہو جائے، اور دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ اب اگر ایک آدمی کے پاس بہت سارا روپیہ ہے، بینک بیلنس ہے، کوٹھی بنگلہ ہے، کاریں ہیں، دنیا

کا سارا ساز و سامان موجود ہے، ان سب کے ہونے کے باوجود اس کے اندر "بے نیازی" پیدا نہیں ہوئی، پھر بھی وہ شخص دوسروں کا حاجت مند رہا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو "غنیٰ" حاصل نہیں۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کی آمدنی کم ہے، گنتی میں اس کے پیسے کم ہیں، لیکن وہ شخص دوسروں سے بے نیاز ہے، وہ کسی کے مال کی طرف منہ اٹھا کر نہیں دیکھتا، کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی کے پیچھے نہیں پھرتا، یہ شخص "غنی" ہے، اس کو "غنیٰ" حاصل ہے، لہٰذا اصل غنیٰ دل کا غنیٰ ہے کہ دل دوسروں سے بے نیاز ہو جائے۔

غنیٰ کے لئے دو چیزوں کی ضرورت

بہرحال! اس جملے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بڑے کام کی بات ارشاد فرما رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین، وہ یہ کہ اپنی قسمت پر راضی ہو جاؤ تو ساری دنیا میں سب سے "غنی" تم ہو گے۔ اس جملے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتوں کی تلقین فرمائی، ایک "قناعت" دوسرے "رضا بالقضاء" تقدیر پر راضی ہونا، اگر یہ باتیں حاصل ہو جائیں تو تم سارے انسانوں میں "غنی" ہو جاؤ گے، پہلی بات ہے "قناعت" قناعت کے معنی ہیں جائز اور مناسب تدبیر اور دوڑ دھوپ کے بعد حلال طریقے سے جو کچھ مجھے مل گیا، بس وہ میرے لئے کافی ہے، مجھے اور زیادہ کی ہوس نہیں، حرص نہیں، اس کا نام ہے قناعت، یہ بہت اہم صفت ہے، جو ہر مؤمن کے اندر مطلوب ہے، اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے دعا مانگی ہے، فرمایا:

اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ

اے اللہ! جو رزق آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے، اس پر مجھے قناعت بھی عطا فرما۔ اس قناعت کے بغیر انسان کو راحت اور سکون حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی

قناعت حاصل کرنے کے لئے آدمی کو یہ سوچنا چاہئے کہ دل میں خواہشات تو بے شمار پیدا ہوتی رہتی ہیں کہ ایسا بن جاؤں، مجھے اتنی دولت حاصل ہو جائے، مجھے کوٹھی اور بنگلہ حاصل ہو جائے، کاریں مل جائیں، یہ سب خواہشات تو دل میں پیدا ہوتی رہتی ہیں، لیکن اس روئے زمین پر کون سا انسان ایسا ہے جس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی ہو؟ کوئی ہے؟ نہیں۔ چاہے بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، چاہے بڑے سے بڑا ولی اللہ ہو، بڑے سے بڑا صوفی ہو، بزرگ ہو، عالم ہو۔ کوئی نہیں ہے جس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی ہو، یہ تو دنیا ہے، جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اس میں تمہاری کچھ خواہشات پوری ہوں گی، اور کچھ نہیں ہوں گی، جب ہر خواہش پوری نہیں ہوگی تو اب دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ یا تو ساری زندگی خواہش پوری نہ ہونے پر کڑھتے رہو، اور یہ شکوہ شکایت کرتے رہو کہ میری فلاں خواہش پوری نہیں ہوئی، میں فلاں چیز چاہ رہا تھا، وہ نہیں ملی، ساری زندگی اس حسرت اور افسوس میں گزار دو۔ اس لئے کہ تقدیر سے زیادہ تو تمہیں کبھی کوئی چیز نہیں مل سکتی، چاہے رو، چاہے فریاد کرو، چاہے کڑھتے رہو، اور لوگوں کے سامنے شکوے کرتے رہو، ملے گا وہی جو تقدیر میں لکھا ہے۔

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ مل رہا ہے اس کو ہنسی خوشی قبول کرلو، اور

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ، اور قناعت اختیار کرلو، بس یہی دو صورتیں ہیں، لہٰذا اللہ جل شانہ کی تقدیر پر اور اس کی تقسیم پر راضی ہو جاؤ کہ تمہیں جتنا کچھ دیا ہے، تمہارے لئے وہی مناسب ہے۔ البتہ جائز اور حلال طریقوں سے تدبیر کرنا منع نہیں، لیکن تدبیر کرنے کے بعد جو مل گیا، اس پر خوش ہو جاؤ کہ ہاں! میرا حق اتنا ہی تھا، جو مجھے میرے اللہ نے دیا، اب اس سے زیادہ کی ہوس میں مبتلا ہو کر خود بھی پریشان ہونا اور دوسروں کو بھی پریشان کرنا، اور اس کے لئے جائز اور ناجائز طریقے استعمال کرنا یہ وہ بلا ہے جس میں آج پوری دنیا مبتلا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس جملے کے ذریعے اس سے بچانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

جائز اور حلال طریقے سے اعتدال سے کماؤ

پہلی بات یہ ہے کہ دولت اور پیسے کے حاصل کرنے کے لئے ناجائز اور حرام تدبیر نہ ہو، بلکہ جو طریقہ بھی پیسے کمانے کا اختیار کرو وہ حلال اور جائز ہونا چاہئے، اور جو کچھ ملے اس پر قناعت اختیار کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ جائز اور حلال طریقوں کو بھی اعتدال کے ساتھ اختیار کرو، یہ نہیں کہ صبح سے کر شام تک بس پیسے کمانے میں منہمک ہے، اور دنیا کی دوڑ دھوپ میں لگا ہوا ہے، سب کچھ مل جانے کے باوجود خواہش یہ ہے کہ اور مل جائے، اس دنیا کی حرص و ہوس اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر وقت دل و دماغ پر دنیا کی فکر سوار ہے۔ ایک مؤمن کے اندر یہ چیز مطلوب نہیں، چاہے وہ جائز اور حلال طریقے سے کر رہا ہو، اس لئے کہ جائز اور حلال طریقوں کے اندر بھی اعتدال مطلوب ہے، یہ نہ ہو کہ دنیا کو اپنے اوپر اس طرح سوار کرلیا کہ اب خواب بھی اس کے آرہے

ہیں، بقول شخصے کہ جس تاجر کے دماغ پر دنیا سوار ہوتی ہے، جب وہ رات کو بستر پر لیٹتا ہے تو آسمان کے ستارے بھی اس کو آپس میں تجارت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ حالت اچھی نہیں۔

پیسوں کو خادم بناؤ، مخدوم نہ بناؤ

ارے بھائی! یہ پیسہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا خادم بنا کر پیدا کیا ہے کہ تمہاری خدمت کرے، نہ یہ کہ یہ پیسہ تمہارا مخدوم بن جائے، اور تم اس کے خادم بن جاؤ کہ میں کس طرح اس کو حاصل کرلوں، کس طرح اس کو رکھوں، کہاں خرچ کروں؟ اور کس طرح مزید پیسہ پیدا کروں؟ ہم نے الٹا معاملہ کرلیا ہے کہ وہ پیسہ جو ہمارا خادم تھا، ہم نے اس کو مخدوم بنا دیا ہے۔ اب اس پیسے کے پیچھے اپنی جان بھی جارہی ہے، صحت بھی خراب ہورہی ہے، دین بھی خراب ہورہا ہے، لوگوں سے تعلقات بھی خراب ہورہے ہیں، اور دن رات یہی فکر ہے۔

سبق آموز واقعہ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ''گلستان'' میں اپنا ایک قصہ لکھا ہے کہ میں ایک مرتبہ سفر پر تھا کہ ایک شہر میں ایک تاجر کے گھر میں مقیم ہوگیا، بہت بڑا تاجر تھا، اس کا گھر بھی عالیشان تھا، اور اس میں دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ جب دسترخوان پر کھانے کے لئے بیٹھے تو بات چیت شروع ہوئی، اس تاجر کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی، میں نے اس تاجر سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت مال و دولت سے نوازا ہے، اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ اس تاجر نے کہا کہ میں نے ساری دنیا میں گھوم لیا، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ عطا فرمایا، لیکن میرے دل میں ایک حسرت ہے وہ یہ کہ میں ایک آخری تجارتی چکر لگانا چاہتا

ہوں، اس کے بعد اپنی بقیہ زندگی اپنے وطن میں گزار دوں گا، میں نے پوچھا کہ وہ آخری چکر کہاں کا ہے؟ اس تاجر نے اس آخری چکر کی تفصیل یہ بتائی کہ میں ایران سے گندھک خرید کر چین جاؤں گا، وہاں سے چینی برتن خرید وں گا، وہ برتن روم میں لے جا کر فروخت کروں گا، اور روم سے ریشم خرید کر ہندوستان میں فروخت کرون گا، اور ہندوستان سے لوہا خرید کر حلب میں فروخت کروں گا، اور حلب کا آئینہ خرید کر یمن میں فروخت کروں گا، اور یمن سے چادریں خرید کر ایران میں فروخت کروں گا، اور اس کے بعد سفر چھوڑ کر ایک دکان میں بیٹھ کر بقیہ زندگی گزار دوں گا، اس کے بعد اس نے شیخ سعدی سے کہا کہ تم بھی تو کہو، تم نے جو سفر میں دیکھا سنا ہو اس کے بارے میں بتاؤ، شیخ سعدی نے کہا کہ یہ دو شعر سن لو:

آں شنیدستی کہ در صحرائے غور
بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پر کند یا خاکِ گور

کہ تم نے یہ قصہ سنا ہے کہ غور کے صحراء میں ایک سردار اپنے خچر پر سامان لے جا رہا تھا، خچر نے اس تاجر کو نیچے گرایا، وہ تاجر مر گیا، اور تجارت کا سارا سامان جنگل میں پڑا رہ گیا، وہ بکھرا ہوا سامان زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نظر کو یا تو قناعت بھر سکتی ہے، یا قبر کی مٹی بھر سکتی ہے، اس کے بھرنے کا کوئی اور راستہ نہیں۔ (گلستان سعدی، ص ۱۲۰)

انسان کا پیٹ قبر کی مٹی بھر سکتی ہے

شیخ سعدیؒ کے یہ اشعار در حقیقت ایک حدیث کا مضمون ہیں، جس میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ:

لو کان لابن آدم وادیاً من ذهب لا بتغیٰ ان یکون له وادیان،ولو کان له وادیان من ذهب لابتغیٰ ان یکون له ثالثاً ،ولا یملأ جوف ابن آدم الا التراب۔

* اگر ابن آدم کو سونے سے بھری ہوئی ایک وادی مل جائے تو وہ چاہے گا کہ میرے پاس سونے کی دو وادیاں ہو جائیں، اور اگر دو وادیاں سونے سے بھری ہوئی مل جائیں تو وہ چاہے گا کہ مجھے تیسری وادی مل جائے، اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی، اس کا پیٹ ہر وقت خالی رہتا ہے، اور کا دل چاہتا ہے کہ اس کے اندر اور آجائے، اور آجائے، اور یہ پیٹ اس وقت بھرے گا جب وہ قبر میں جائے گا، اور قبر کی مٹی اس میں داخل ہو گی تب وہ بھرے گا، اس سے پہلے قناعت حاصل نہیں ہو گی۔

حرص وہوس چھوڑ دو

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ اگر راحت چاہتے ہو تو قناعت پیدا کرو، وہ یہ کہ جائز اور حلال طریقے سے جو کچھ مجھے مل رہا ہے، وہ الحمد للہ میرے لئے ایک نعمت ہے، مجھے زیادہ کی ہوس نہیں۔ ایک بہت بڑا فتنہ جو ہمیشہ سے ہے، لیکن آج یہ فتنہ بہت بڑھا ہوا ہے، وہ حرص و ہوس ہے، مثلاً یہ حرص ہے کہ فلاں کے پاس جیسا بنگلہ ہے، میرے پاس بھی ویسا بنگلہ ہو، فلاں کے پاس جیسی گاڑی ہے، میرے پاس بھی ویسی گاڑی ہو، فلاں کے پاس جیسا کارخانہ ہے، میرے پاس بھی ایسا کارخانہ ہو۔ بلکہ میں اس سے بھی آگے بڑھ جاؤں، آگے بڑھنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے، اگر فرض کرو

کہ اس دوڑ کے باوجود حلال وحرام کی فکر ہے، تب بھی اپنے دل کا سکون تو اس دوڑ کے نتیجے میں غارت کیے ہوئے ہے کہ مجھے اور مل جائے، اور مل جائے۔

اپنے سے اونچے آدمی کو مت دیکھو

اب سوال یہ ہے کہ قناعت کیسے پیدا ہوگی؟ اس کے بارے میں فرمایا کہ دنیا کے معاملات میں اپنے سے اونچے آدمی کو مت دیکھو، بلکہ اپنے سے نیچے آدمی کو دیکھو، اس لئے کہ اگر اپنے سے اونچے آدمی کو دیکھو گے تو ہر وقت دل میں یہ حسرت رہے گی کہ اچھا اس کے پاس ایسی گاڑی ہے، میرے پاس بھی ایسی گاڑی ہونی چاہئے، اس کے پاس ایسا مکان ہے، میرے پاس بھی ایسا مکان ہونا چاہئے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہوس بڑھتی چلی جائے گی، لیکن جب تم اپنے سے نیچے آدمی کو دیکھو گے تو اس صورت میں شکر کے جذبات پیدا ہوں گے، تم یہ سوچو گے کہ یہ بھی میری طرح گوشت پوست کا انسان ہے، اور یہ اس حالت میں زندگی گزار رہا ہے، مجھے تو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ نوازا ہے، مجھے تو اس کا شکر ادا کرنا چاہئے، یہ سوچنے سے انسان کے اندر ''قناعت'' پیدا ہوگی۔ لہٰذا اپنے سے کمتر کو دیکھا کرو۔

حضرت ابن عونؒ کا واقعہ

محدثین میں ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت ابن عون رحمۃ اللہ علیہ، وہ فرماتے ہیں کہ ابتدائی زندگی میں میرا دولتمندوں اور مالداروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ''فلم ارا کثر ھما منی'' یعنی مجھ سے زیادہ کوئی غمگین نہیں تھا، اس لئے کہ میں جس شخص کو دیکھتا، اس کا کپڑا میرے کپڑے سے اچھا ہے، اس کا کھانا میرے کھانے سے اچھا ہے، اس کا گھر میرے گھر سے اچھا

ہے، اس کی سواری میرے سواری سے اچھی ہے، اس لئے میں ہر وقت دل میں پریشان اور غمگین رہتا، پھر بعد میں میں نے فقراء اور غریبوں کی مجالست اور ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا اختیار کیا تو ''فاسترحت'' مجھے آرام مل گیا، کیوں؟ اس لئے اب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ہر شخص مالی اعتبار سے مجھ سے کمتر ہے، اور یہ دیکھتا ہوں کہ میرا مکان ان کے مکانات سے اچھا ہے، میری سواری ان کی سواری سے اچھی ہے، میرے کپڑے ان کے کپڑوں سے اچھے ہیں، اب میں اپنی اس حالت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سب کے مقابلے میں اچھی حالت میں رکھا ہے۔

دنیا کا مہنگا ترین بازار

ارے بھائی! اگر تم اپنے سے اوپر دیکھنا شروع کرو گے تو اوپر والوں کی کوئی حد اور انتہا ہی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں امریکہ میں گیا، امریکا کے شہر لاس اینجلس میں ایک بازار ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا مہنگا ترین بازار ہے، اس بازار میں میرا جانا ہوا، میرے میزبان نے ایک دکان کی طرف اشارہ کیا، اور کہا کہ یہ دکان ایسی ہے کہ اس دکان میں رکھی ہوئی اشیاء کی قیمتیں تصور سے بھی زیادہ ہیں، مثلاً یہ موزے جو سامنے رکھے ہوئے ہیں، ان کی قیمت 200 ڈالر ہے، اور یہ سوٹ تیس ہزار ڈالر کا ہے، ہمارے حساب سے بارہ لاکھ روپے کا ایک سوٹ، اور یہ دکان دار صرف کپڑے اور سوٹ فروخت نہیں کرتا، بلکہ یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ آپ کے جسم پر کس قسم کا، کس ڈیزائن کا اور کس کلر کا لباس مناسب ہوگا، اور اس مشورے کے دس ہزار ڈالر الگ چارج کرتا ہے، اور پھر اس سوٹ کی تیاری پر چالیس، پچاس ہزار ڈالر الگ ہوں

گے، اس طرح ایک سوٹ جو آپ سر سے لے کر پاؤں تک پہنیں گے پچاس
، ساٹھ ہزار ڈالر میں تیار ہوگا۔

شہزادہ چارلیس اور دلی خواہش

اور اس شخص سے لباس کے بارے میں مشورہ لینے کے لئے مہینوں پہلے
وقت لینا پڑتا ہے، اور برطانیہ کے شہزادہ چارلیس نے اس سے وقت مانگا تو دو
مہینے بعد کا وقت ملا، اب وہ شہزادہ چارلیس دو مہینے تک تکلیف میں رہا، اس لئے
کہ اس کا دل چاہ رہا ہے کہ اس سے ملاقات کی فضیلت مجھے حاصل ہو جائے،
اور پھر اس کے مشورے سے تیار کردہ سوٹ میں بھی پہنوں، اور پیسے خرچ
کرنے کے لئے بھی تیار ہے، لیکن اس کے باوجود بھی دل کی خواہش پوری
نہیں ہو رہی ہے۔ یہ بھی دولت خرچ کرنے کا ایک طریقہ ہے، اب اس کو
دیکھو، اور سوچو کہ میں اس طرح لباس تیار کرا کر پہنوں، نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری
زندگی حسرت میں گزر جائے گی، لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر تم
اپنے سے اوپر دیکھنا شروع کرو گے تو اس کی کوئی حد نہیں۔

کس طرف دیکھو گے؟

جس بازار کا میں یہ واقعہ بتا رہا ہوں، اسی بازار سے دو میل کے فاصلے
پر ایک اور بازار میں یہ منظر بھی دیکھا کہ وہاں پر لوگ ٹرالیاں لے کر جا رہے
ہیں، اور کوکا کولا، اور پیپسی کولا کے خالی ڈبے جمع کر رہے ہیں، اور ان کو
فروخت کر کے اپنا پیٹ پال رہے ہیں، اور رات کو سوتے وقت اسی ٹرالی میں
سے ایک کمبل نکالا، اور راستے کے کنارے ٹرالی کھڑی کی، اور وہیں فٹ پاتھ
پر سردی میں سو گئے۔ اب بتاؤ! اُدھر دیکھو گے؟ یا اِدھر دیکھو گے؟ اگر اُدھر دیکھو

گے تو تمہارا پیٹ کبھی نہیں بھرے گا، کبھی تمہاری آنکھ سیر نہیں ہوگی، کبھی تمہیں آرام اور سکون حاصل نہیں ہوگا، لیکن اگر دوسری طرف دیکھو گے اور یہ سوچو گے کہ یہ بھی اللہ کے بندے ہیں، کس طرح رات گزارتے ہیں، ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سو کر رات گزار رہے ہیں، اللہ نے مجھے تو راحت اور آرام والا مکان عطا فرمایا ہے، اس سوچ کے نتیجے میں اطمینان اور سکون عطا ہوگا۔ اس لئے حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اصول بتا دیا کہ دین کے معاملے میں اپنے سے اعلیٰ کو دیکھو، اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے کمتر کو دیکھو، تو اس کے نتیجے میں شکر پیدا ہوگا، اور قناعت پیدا ہوگی۔

حرص و ہوس انسان کو جلاتی رہتی ہے

قناعت سے بہتر کوئی دولت نہیں، کیونکہ جب انسان کے دل میں ہوس کی آگ لگ جاتی ہے تو پھر اس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہوتی، پھر یہ ہوس انسان کو جلاتی رہتی ہے، اور حاصل کچھ نہیں ہوتا، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ دعا سکھائی، ہم سب کو یہ دعا مانگنی چاہئے، اگر عربی الفاظ یاد ہو جائے تو بہت اچھا ہے، ورنہ اردو میں ہی مانگ لیا کریں، وہ دعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَ اخْلُفْ عَلٰی کُلِّ غَائِبَۃٍ لِّیْ مِنْکَ بِخَیْرٍ

اے اللہ! جو کچھ آپ نے مجھے رزق عطا فرمایا ہے، اس پر مجھے قناعت عطا فرما دیجئے، اور جو نعمتیں مجھے حاصل نہیں ہیں، ان کے بدلے میں مجھے اپنی طرف سے جو میرے حق میں بہتر ہو وہ عطا فرما۔ ہوسکتا ہے کہ میں جس چیز کی خواہش کر رہا ہوں، وہ میرے حق میں ٹھیک نہ ہو، مناسب نہ ہو، لیکن آپ اپنے فضل و کرم سے جو ہمیں عطا فرمائیں گے، وہی میرے حق میں مناسب ہوگا،

وہی مجھے عطا فرمادیں۔

ایک خوبصورت دعا

ایک اور دعا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سکھائی کہ:

اَللّٰهُمَّ مَا رَزَقْتَنِيْ مِمَّا أُحِبُّ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِّيْ فِيْمَا تُحِبُّ ،
وَمَا زَوَيْتَ عَنِّيْ مِمَّا أُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًا لِّيْ فِيْمَا تُحِبُّ

کیا عجیب وغریب دعا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی ہے، فرمایا کہ اے اللہ! میری پسندیدہ چیز جو آپ نے مجھے عطا فرمائی ہے، اس چیز کو ان کاموں کا ذریعہ بنا دیجئے جو آپ کو پسند ہیں۔ اور میری پسندیدہ چیز جو آپ نے مجھے نہیں دی تو اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما دیجئے جو آپ کی پسند ہے۔ نبی کے علاوہ کوئی دوسرا شخص یہ دعا مانگ ہی نہیں سکتا، بہرحال! قناعت کے بغیر اس دنیا میں راحت حاصل نہیں ہوسکتی۔

دولت نے بیٹے کو باپ سے دور کر دیا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ والد صاحب کے جاننے والوں میں ایک تاجر تھے، ان کا ایک کاروبار کراچی میں تھا، ایک ممبئی میں، ایک سنگاپور میں، ایک بنکاک میں تھا، کئی شہروں میں فیکٹریاں لگی ہوئی تھیں، ایک بیٹا سنگاپور میں کام کر رہا ہے، ایک بنکاک میں کام کر رہا ہے، ایک ممبئی میں کام کر رہا ہے، اور خود کراچی میں کام کر رہے ہیں۔ والد صاحب نے ایک دن ان سے پوچھا کہ آپ کی اپنے بیٹوں سے ملاقات ہو جاتی ہے؟ جواب میں کہنے لگے کہ میری اپنے بیٹے سے ملاقات کو اتنے سال ہو گئے ہیں، گویا کہ ایک بیٹا اپنے کاروبار میں مگن ہے، اور دوسرا بیٹا اپنے کاروبار میں مگن

ہے، اور باپ اپنے کاروبار میں مگن ہیں، سالہا سال سے باپ نے اپنے بیٹے کی شکل نہیں دیکھی، اور بیٹے نے باپ کی شکل نہیں دیکھی، اور پیسوں کی گنتی میں روز اضافہ ہو رہا ہے۔ ارے بھائی! جن پیسوں کے نتیجے میں انسان کو اپنی اولاد سے، اپنے باپ سے ملنے کی نعمت نصیب نہ ہو، ایسا پیسہ کس کام کا؟

اولاد کا قرب بڑی نعمت ہے

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں ایک کافر کا واقعہ بیان کیا ہے، جو بڑا اکھڑ قسم کا کافر تھا اور ہم نے اس کو کیسی نعمتوں سے نوازا تھا، فرمایا:

وَ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا (المدثر: ۱۲، ۱۳)

یعنی ہم نے اس کو مال بھی بے انتہا دیا تھا، اور اس کو اولاد بھی دی تھی جو اس کے پاس موجود تھی۔ جس سے معلوم ہوا کہ اولاد کا پاس موجود ہونا یہ اللہ جل شانہ کی عظیم نعمت ہے، اگر انسان کے پاس روپیہ پیسہ تو ہو لیکن اولاد قریب نہ ہو تو ان پیسوں کا کیا فائدہ؟

اس مقدار پر راضی ہو جاؤ

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ اگر تم صحیح معنی میں مالداری چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اس مقدار پر راضی ہو جاؤ جو اللہ جل شانہ نے تمہاری قسمت کے حساب سے تمہیں عطا فرما دی، تو پھر انشاء اللہ راحت اور آرام میں رہو گے، اور پھر کسی کے محتاج نہیں ہو گے، اور نہ کسی کی طرف تمہاری نگاہیں اٹھیں گی، اور تم سیر چشم رہو گے۔ لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی نہ ہو گے تو پھر ہزار ہاتھ پاؤں مارتے رہو، اور دل میں غمگین

بھی ہوتے رہو، کبھی بھی دل کا غنیٰ حاصل نہیں ہوگا، جو اصل مقصود ہے۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

خلاصہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملے میں دو باتوں کی تاکید فرمائی ہے، ایک قناعت حاصل کرنے کی، دوسرے رضا بالقضاء کی، آج مختصراً "قناعت" کے بارے میں عرض کردیا کہ اپنے تمام معاملات میں جائز اور حلال طریقے سے جو کچھ حاصل ہورہا ہے، اس پر خوش ہو جاؤ، دوسروں کی طرف مت دیکھو کہ دوسروں کے پاس کیا ہے؟ ارے بھائی! دوسرے کا معاملہ وہ جانے، تمہارا معاملہ تم جانو، تم اس فکر میں کیوں پڑے ہو کہ دوسرے کے پاس کیا ہے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا خوبصورت، بڑا معنی خیز شعر ہے، اگر انسان اس پر عمل کرے تو اس کو بڑا سکون حاصل ہو جائے، فرماتے ہیں:

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مئے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

مجھے اس سے کیا غرض کہ کس کے گلاس میں کتنی ہے، ہاں مجھے جو کچھ ملا ہے، وہ میرے لئے حاصل میخانہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے، درحقیقت وہی میرے لئے کافی ہے، قناعت یہ ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے پر راضی ہو جاؤ، اور اس کو اپنے لئے نعمت سمجھو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کو شکر ادا کرو، اور دوسروں کی طرف دیکھ کر حرص و ہوس میں مبتلا نہ ہو۔

تجارت کو ترقی دینا قناعت کے خلاف نہیں

یہاں میں ایک اور وضاحت کردوں، وہ یہ کہ لوگ بعض اوقات ''قناعت'' کا مطلب یہ سمجھ بیٹھتے ہیں، اور اس ساری گفتگو کا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جو شخص تاجر ہے اس کو آگے تجارت بڑھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، قناعت کا مقصد یہ نہیں، میں نے تین الفاظ استعمال کیے، ایک یہ کہ مال کمانے ۔ طریقہ جائز ہو، دوسرے وہ مال حلال ہو، تیسرے یہ کہ اعتدال کے ساتھ ہو، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَ تَوَکَّلُوْا عَلَیْہِ '' لہٰذا اعتدال کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کمانے کو اپنے اوپر سوار نہ کرو، مال کے خادم نہ بنو، اب اگر ایک شخص جائز طریقے سے اور اعتدال کے ساتھ اپنے کاروبار کو بڑھا رہا ہے، تو شریعت نے اس پر نہ صرف یہ کہ پابندی عائد نہیں کی، بلکہ یہ عمل قناعت کے بھی منافی نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے کاروبار کو ناجائز اور حرام طریقے سے بڑھا رہا ہے، وہ تو بالکل ہی حرام ہے، دوسرا یہ کہ اگرچہ ناجائز کا ارتکاب نہیں ہو رہا ہے، لیکن اعتدال سے بڑھا ہوا ہے، اس لئے کہ دن رات مال بڑھانے کے علاوہ کوئی اور فکر ہی نہیں ہے، یا اس کاروبار کے نتیجے میں دوسروں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، یہ بھی اعتدال سے بڑھنے میں داخل ہے، تیسرے یہ کہ آدمی اس کاروبار میں ایسا مشغول ہو گیا ہے کہ اب اس کو کسی دینی محفل میں جانے کی فرصت نہیں، دین کی بات سیکھنے کی فرصت نہیں، کسی اللہ والے کے پاس جا کر بیٹھنے کی فرصت نہیں، یہ بھی اعتدال سے خارج ہے، اور قناعت کے خلاف ہے۔

بہرحال! اعتدال کے ساتھ، جائز طریقے سے دنیا کماؤ، اور جو ملے اس

پر راضی رہو، بس اسی کا نام قناعت ہے، اس دنیا میں قناعت کے علاوہ راحت حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو قناعت کی دولت عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا۔۔۔ اما بعدفقد قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : وَارْضِ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لَکَ تَکُنْ اَغْنَی النَّاسِ۔

تمہید

یہ ایک حدیث ہے جس کا بیان گذشتہ دو تین روز سے چل رہا ہے، جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ جملے ارشاد فرمائے، اور ہر جملہ ایک

مستقل نصیحت پر مشتمل ہے، پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا: اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ۔ گناہوں سے بچو تو تم ساری دنیا میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔ دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا: وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ اَغْنَى النَّاسِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر راضی ہو جاؤ تو تم سارے انسانوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس دوسرے جملے میں دو نصیحتیں ہیں، ایک یہ کہ انسان قناعت اختیار کرے، یعنی جائز اور حلال طریقے سے جو کچھ اسے مل رہا ہے اس پر صبر اور شکر کرے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی تقدیر پر اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہے، جس کو "رضابالقضاء" کہتے ہیں، قناعت کے بارے میں گذشتہ کل کچھ گذارشات عرض کر دیں تھیں۔

اس کائنات میں تین عالم ہیں

اس جملے کا دوسرا پہلو "رضا بالقضاء" ہے، یہ صرف مال و دولت ہی کے معاملے میں نہیں، بلکہ زندگی میں انسان کے ساتھ جتنے واقعات پیش آتے ہیں، ان سب میں اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا "رضا بالقضاء" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں، ایک عالم وہ ہے جس میں خوشی ہی خوشی ہے، راحت ہی راحت ہے، رنج کا وہاں نام نہیں، تکلیف کا وہاں گزر نہیں، وہ عالم جنت ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو عطا فرمائے، آمین۔ دوسرا عالم وہ ہے جہاں تکلیف ہی تکلیف ہے، رنج ہی رنج ہے، صدمہ ہی صدمہ ہے، وہ ہے عالم جہنم، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس سے پناہ میں رکھے، آمین۔ ان دونوں کے درمیان یہ "عالم دنیا" ہے، جس

میں خوشی بھی ہے، رنج بھی ہے، راحت بھی ہے، تکلیف بھی ہے، اس کائنات میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو خوشی ہی خوشی ملی ہو، صدمہ نہ ملا ہو، یا جس کو صدمہ ہی صدمہ ملا ہو، خوشی نہ ملی ہو، بلکہ دنیا میں دونوں چیزیں ملی جلی چلتی ہیں۔

رنج اور تکلیف ضرور پہنچے گی

لہٰذا اس دنیا میں ایسے واقعات لازماً پیش آنے ہیں جو انسان کی طبیعت کے خلاف ہوں گے، جن سے انسان کو صدمہ اور رنج پہنچے گا، تکلیف پہنچے گی، لیکن اس تکلیف کے نتیجے میں چاہے آدمی روئے، چاہے اظہار رنج کرے، لیکن اس کا دل اس بات پر راضی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو فیصلہ کیا ہے، وہ فیصلہ برحق ہے، اگرچہ اس سے مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے، اسی کا نام "رضا بالقضاء" ہے، مثلاً کوئی بیماری آگئی، اب اس بیماری کی وجہ سے تکلیف ہو رہی ہے، صدمہ بھی ہے، آہ بھی منہ سے نکل رہی ہے، رونا بھی آرہا ہے، لیکن دل اس بات پر مطمئن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جو بیماری بھیجی ہے، ان کا فیصلہ برحق ہے، مجھے اس پر کوئی شکوہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے مجھے کوئی شکایت نہیں، اس کا نام "رضا بالقضاء" ہے، جو مطلوب ہے۔

دل میں شکایت نہ ہو

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کی وفات ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ آنکھ سے آنسو جاری ہیں، دل میں صدمہ ہو رہا ہے، لیکن ہم چونکہ اللہ جل شانہ کے فیصلے پر راضی ہیں، لہٰذا ہم وہی کہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ لہٰذا "رضا بالقضا" میں دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ صدمہ بھی ہے، آنسو بھی بہہ رہے ہیں، تکلیف بھی ہو رہی

ہے، لیکن دل اللہ جل شانہ کے فیصلے پر مطمئن ہے کہ اس نے تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا وہ برحق تھا، اور حکمت کے عین مطابق تھا، یہ ہے "رضا بالقضاء" اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمادے، آمین۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچے تو وہ یہ کہنا شروع کردے کہ یہ مصیبت مجھ پر ہی کیوں آئی؟ ایسا میں نے کون سا گناہ کرلیا جس کی پاداش میں پکڑا گیا۔ العیاذ باللہ۔ اس قسم کے کلمات زبان سے نکل جاتے ہیں، یہ درحقیقت بے صبری ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر شکوہ ہے، جس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہئے، اور کبھی ایسا جملہ زبان پر نہیں لانا چاہئے۔

رونے کی اجازت دیدی

یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ باوجودیکہ ان کا ہر فیصلہ حکمت کے عین مطابق ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں مصیبت اور تکلیف پر رونے کی اجازت دے رکھی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ میں نے یہ فیصلہ اپنی حکمت کے مطابق کیا ہے، اور اسی میں تمہارے لئے خیر ہے، اور اس پر تمہیں رونے کی اجازت نہیں۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے ضعف اور ہماری کمزوری سے باخبر ہیں، اور جانتے ہیں کہ اس بندے کو ہماری حکمتوں کا پتہ نہیں، لہٰذا اگر یہ رورہا ہے تو رونے دو، بلکہ فرمایا ہم رونے پر اور دل کے صدمے پر تمہیں اجر بھی دیں گے، بس ایک بات کا مطالبہ ہے، وہ یہ کہ ہمارے فیصلے پر اعتراض نہ کرنا، شکایت نہ کرنا۔

جو اللہ کی مرضی وہی میری مرضی

اسی واسطے حضرت ذالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے

کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! کیسے مزاج ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ اس شخص کا کیا مزاج پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، یعنی اپنے بارے میں فرمایا کہ جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے وہ میرے مزاج کے مطابق ہو رہا ہے، اس لئے مجھ سے زیادہ خوشی میں عیش و آرام میں کون ہوگا؟ سوال کرنے والے نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج تک کسی شخص کے بارے میں نہ یہ سنا اور نہ یہ دیکھا کہ ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہو، یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی ایسا نہیں ہوا کہ جو انبیاء کرام نے چاہا ہو وہ ہو گیا ہو، آپ کے ساتھ یہ کیسے ہو گیا؟ جواب میں حضرت ذالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے، یعنی جو میرے مولیٰ کی مشیت، وہ ہی میری بھی مرضی، میرے مولیٰ نے جو فیصلہ کر دیا، میں بھی اس پر راضی ہوں، بس اب کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، اس لئے کہ میری مرضی وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہے۔

حضرت خضرؑ سے ملاقات کا حکم

بھائی! اگر انسان اللہ تعالیٰ نے فیصلے پر راضی ہو جائے تو اس سے زیادہ راحت کا کوئی اور کام نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی کیوں ہو جائے؟ جبکہ بظاہر وہ فیصلہ دیکھنے میں برا اور تکلیف دہ معلوم ہو رہا ہے، اس کی وجہ اللہ جل شانہ نے سورۃ الکہف میں بیان فرما دی، جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کا واقعہ بیان فرمایا ہے، اس ملاقات کا سبب یہ ہوا کہ کسی شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ

اس وقت روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے؟ ظاہر ہے کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے، اور پوری روئے زمین پر آپ کا مقام سب سے اعلیٰ تھا، اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ ''سب سے بڑا عالم میں ہوں'' اس لئے کہ پیغمبر سے بڑا عالم تو کوئی ہوتا نہیں، لیکن اللہ جل شانہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ جواب پسند نہیں آیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو سب سے بڑا عالم کہہ دیا، اور ساتھ میں ان کو تنبیہ کرنی مقصود تھی کہ علم کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا چاہئے تھا، اور یوں کہنا چاہئے تھا کہ ہمیں کیا معلوم کہ کون بڑا عالم ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ ہم تمہیں ایک ایسے بندے کے پاس بھیجتے ہیں جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیج دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خاموش نہ رہنا

اور یہ حکم دیا کہ کچھ دن ان کے پاس رہو، اور ان کی صحبت حاصل کرو، اب حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پابندی لگا دی کہ اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو خاموش رہنا ہوگا، میرے سے کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے وعدہ کرلیا کہ اچھی بات ہے، مگر جب ان کے ساتھ سفر پر چلے تو دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام جو کام کر رہے ہیں وہ الٹا کر رہے ہیں، چنانچہ دریا پار کرنے کے لئے کشتی میں بیٹھے تو اس کشتی کے تختے نکال دیے، حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے، آپ سے خاموش نہیں رہا گیا، آپ نے فرمایا: لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا (الکہف: ۷۱)۔ (یعنی تم نے ایک عجیب چیز کر لی) حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے تو پہلے

ہی کہہ دیا تھا کہ خاموش رہنا، کچھ مت بولنا، جب تک میں نہ بتاؤں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اچھا معاف کرو: لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ أَمْرِيْ عُسْرًا (الکہف:۷۳)۔ (میرے بھولنے پر مواخذہ نہ کریں، میرا کام مجھ پر مشکل مت کیجئے) جب آگے چلے تو دیکھا کہ ایک بچہ کھیل رہا ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے اس بچے کو قتل کر دیا، اب وہ بچہ نابالغ معصوم، وہ بچہ کسی گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوا، ایسے بچے کو قتل کر دینا بڑا سنگین گناہ تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام تو پیغمبر تھے، ایسے فعل کو کیسے برداشت کر سکتے تھے، فوراً انہوں نے اور زیادہ شدت سے اس عمل پر نکیر کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا (الکہف:۷۴)۔ یہ تو تم نے بہت برا کام کیا کہ ایک بچے کو مار ڈالا، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے ساتھ چپ چاپ چلنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس قسم کے منظر دیکھنا میرے بس کی بات نہیں، اب اگر میں بولوں تو آپ کا راستہ الگ، میرا راستہ الگ، میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

ان کی دنیا اور ہے

اس طرح اللہ جل شانہ نے مختلف واقعات دکھائے، اب دیکھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وعدہ کر چکے تھے کہ آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گا، اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ میں سوال نہیں کروں، تو میں سوال نہیں کروں گا، لیکن جب وقت آیا تو ہر جگہ پوچھا، ہر جگہ اعتراض کیا، کیوں؟ اس لئے کہ وعدہ اپنی جگہ تھا، لیکن شریعت کا حکم اپنی جگہ تھا، شریعت کا حکم یہی ہے کہ اگر تم کسی بچے کو قتل ہوتا دیکھ رہے ہو تو اس کو روکو، اس وقت خاموش رہنا شریعت کا تقاضا

نہیں۔ بعد میں حضرت خضر علیہ السلام نے ان تمام امور کی وجہ بیان کی کہ میں نے کون سا کام کیوں کیا تھا، کشتی کا تختہ کیوں نکالا تھا؟ بچے کو قتل کیوں کیا تھا؟ اور وہ دیوار کیوں سیدھی کی تھی؟ اس کی تفصیل بتاتا ہوں کہ اس بچے کے پیچھے کیا مقاصد تھے؟ چنانچہ وہ مقاصد بتادیے، سمجھ میں بھی آگئے، پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ آگے نہیں چلے، اس لئے کہ ان کی دنیا اور ہے، ہماری دنیا اور ہے، ہمارا تمہارا میل نہیں ہوسکتا۔

ہر واقعہ میں حکمتیں پوشیدہ ہیں

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جو بھیجا تھا، اس کے ذریعے درحقیقت یہ دکھانا تھا، اور اس حقیقت کی وضاحت ذہن نشین کرانی تھی کہ کائنات میں جو واقعات پیش آرہے ہیں، تم ان واقعات کی صرف ظاہر پر مت جاؤ، بلکہ ان کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی نہ جانے کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں جو تمہاری عقل کی ادراک سے ماوراء ہیں۔ ایک دنیا وہ ہے جس کو ''تشریعی دنیا'' کہا جاتا ہے، یعنی اللہ کی شریعت کی دنیا جس میں ظاہری احکام کے ہم مکلف ہیں، مثلاً یہ کہ کسی کو نقصان مت پہنچاؤ، کسی کو تکلیف مت دو، کسی کو قتل مت کرو، کسی کی آبروریزی نہ کرو وغیرہ، اور ہم ان ظاہری احکام کے مکلف ہیں۔

بچے کو قتل کرنے کی حکمت

لیکن کائنات میں جو واقعات ہمیں ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، جن کو ہم دیکھتے اور سنتے ہیں، ہم ان واقعات کو اپنے محدود مفاد کے دائرے میں رہ

کر سوچتے ہیں، جبکہ ان واقعات کا فیصلہ اس ذات کی طرف سے ہو رہا ہوتا ہے جس کے قبضہ قدرت میں پوری کائنات کی وسعتیں ہیں، وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اب حضرت خضر علیہ السلام کے واقعے میں دیکھئے کہ انہوں نے اس بچے کو قتل کر دیا، اگر حضرت خضر علیہ السلام اس کو قتل نہ کرتے، بلکہ اچانک وہ بچہ مر جاتا، یا کوئی دوسرا آدمی اس کو قتل کر دیتا تو آپ اس وقت یہی سوچتے کہ یہ بہت برا کام ہوا، اس لئے کہ یہ نابالغ اور معصوم بچہ تھا، اور کسی نے اس کو قتل کر دیا، آپ اس بچے کو مظلوم سمجھتے، اور اس پر ترس کھاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دکھا دیا کہ یہ واقعہ ظاہری نظر میں تو بہت برا تھا، لیکن اس واقعے کے پیچھے کائنات کے مجموعی نظام کے تحت جو حکمت تھی وہ کچھ اور تھی، اس لئے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر سرکش ہونے والا تھا، اور یہ بچہ اپنے ماں باپ کو بھی دین سے گمراہ کر دینے والا تھا، لہذا ہم نے اس بچے کو ختم کر دیا، اور اس کے بدلے دوسرا بچہ دیدیا، حضرت خضر علیہ السلام نے یہ حکمت بتادی۔

اپنی عقل کو چھوڑ دو

لیکن اگر انسان اپنی عقل سے سارے فیصلے کرنے لگے تو وہ یہاں پر اعتراض کر سکتا ہے کہ اس بچے کو پیدا کر کے مار دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ تعالیٰ اس بچے کو پیدا ہی نہ کرتے، اور اس کے ماں باپ کو پہلے ہی اچھا بچہ دیدیتے، ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس کا کیا جواب ہے؟ یاد رکھئے انسان کے پاس آخر کار اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ انسان اپنی عقل کے ہتھیار ڈال دے، اور یہ کہہ دے کہ یہ سارے فیصلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہو رہے ہیں، ہماری محدود عقل اس کی حکمتوں اور اس کے فوائد کا ادراک کر ہی نہیں سکتی۔ بہر حال!

بظاہر بچے کے قتل کا واقعہ بر انظر آ رہا ہے، لیکن پوری کائنات کے مجموعی انتظام کے لحاظ سے وہ عظیم واقعہ ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے گھر میں

ان کی حکمت اور مصلحت کو دیکھیے کہ فرعون کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرا رہے ہیں، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے "سامری" کی پرورش کرا رہے ہیں:

وَ مُوْسیٰ الَّذِیْ رَبَّہٗ جِبْرِیْلُ کَافِرٌ
وَمُوْسیٰ الَّذِیْ رَبَّہٗ فِرْعَوْنُ مُرْسَلٌ

سامری کا نام بھی "موسیٰ" تھا، اس کی پرورش حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کی تھی، جب فرعون نے بچوں کے قتل کا حکم جاری کیا تو اس وقت سامری کی پیدائش ہوئی تو سامری کی ماں نے اس کو پہاڑ کی ایک غار میں رکھ دیا، اس غار میں اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل امین کو بھیج دیا کہ اس غار میں ایک بچہ پڑا ہوا ہے، اس بچے کو کھلاؤ پلاؤ، اور اسکی پرورش کرو، چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام روزانہ اس بچے کو کھلاتے پلاتے تھے۔ لیکن وہ بچہ بڑا ہونے کے بعد "سامری" جادوگر کافر بن گیا، اس شعر میں یہی کہا جا رہا ہے کہ جس موسیٰ کو جبرئیل امین نے پالا وہ کافر ہو گیا، اور جس موسیٰ کو فرعون نے پالا وہ پیغمبر ہوئے، یہ تو ان کی حکمت اور قدرت کے کرشمے ہیں، جو انسان کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔

عبرتناک واقعہ

ایک قصہ کتابوں میں لکھا ہے۔ یہ قصہ کتنا مستند اور درست ہے؟ یہ تو اللہ

ہی کو معلوم ہے، لیکن یہ قصہ بڑا عبرتناک ہے، وہ یہ کہ اللہ جل شانہ نے ملک الموت سے پوچھا کہ میں نے تمہیں انسانوں کی روحیں قبض کرنے پر مقرر کر رکھا ہے، اور تم بے شمار انسانوں کی روحیں روزانہ قبض کرتے ہو، کیا کبھی کسی شخص کی روح قبض کرتے ہوئے تمہیں ترس بھی آیا؟ جواب میں ملک الموت نے کہا کہ ہاں! ترس آیا، اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کس پر ترس آیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ دو آدمیوں پر مجھے ترس آیا، اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کون سے دو آدمیوں پر تمہیں ترس آیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ سمندر میں جہاز جارہا تھا، طوفان آیا، اور طوفان میں وہ جہاز تباہ ہوگیا، لوگ ڈوب گئے، کچھ لوگ جنہیں تختوں کا سہارا مل گیا، وہ بچ گئے، ایک عورت جو حاملہ تھی، وہ بھی کسی طرح ایک تختے پر سوار ہوگئی، اور اسی تختے پر وہ کنارے کی طرف جارہی تھی کہ اس کا بچہ پیدا ہوگیا، جب بچہ پیدا ہوگیا تو آپ کی طرف سے یہ حکم آیا کہ ماں کی روح قبض کرلو، میں نے سوچا کہ یہ بچہ ابھی دنیا میں آیا ہے، نہ اس بچے کا کوئی گھر ہے، نہ اس کا باپ ہے، نہ کوئی اور رشتہ دار دیکھنے والا ہے، لے دے کے ایک ماں تھی، اس کی روح قبض کرنے کا حکم دیدیا، مجھے اس بچے پر ترس آیا کہ یہ بچہ سمندر کے بیچ میں تختے پر کس طرح زندگی گزارے گا۔

شداد پر ملک الموت کا ترس کھانا

اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اور کس پر ترس آیا؟ جواب میں ملک الموت نے کہا کہ ایک بادشاہ تھا، جس نے دنیا میں ایک جنت بنوائی، اور اپنا زندگی بھر کا سرمایہ اس جنت کو بنانے پر خرچ کردیا، اور بڑی عالیشان جنت بنارہا تھا، اور اس نے یہ تہیہ کیا تھا کہ جب تک وہ جنت مکمل طور پر تیار نہیں ہوجائے گی، اس

وقت تک اس کے اندر داخل نہیں ہوں گا، جب مدتوں کے بعد تیار ہوگئی تو اس وقت اس نے اس جنت کے اندر جانے کا ارادہ کیا، جب وہ اندر داخل ہونے لگا اور ابھی اس کا ایک پاؤں جنت کے اندر تھا، اور ایک پاؤں جنت کے باہر تھا، اس وقت آپ کا حکم آ گیا کہ اس کی روح قبض کرلو، اس وقت مجھے اس پر ترس آیا کہ یہ شخص کیسا ہی برا سہی، لیکن اس نے اتنی محنت و مشقت سے وہ جنت بنوائی تھی، کم از کم اندر جا کر اس جنت کو دیکھ ہی لیتا، اور کم از کم اس کی محنت کا کچھ صلہ اس کو دنیا کے اندر مل جاتا۔

ایک آدمی پر دو مرتبہ ترس کھانا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ملک الموت! تم نے ایک ہی آدمی پر دو مرتبہ ترس کھایا، اس لئے کہ یہ بادشاہ وہی بچہ تھا جس کو تختے پر تیرتا ہوا تم نے دیکھا تھا، اور اس کی ماں کی روح قبض کرتے وقت تم نے اس بچے پر ترس کھایا تھا، وہی بچہ اب بادشاہ بن گیا تھا، اور اب اس بادشاہ کی روح قبض کرتے ہوئے تم نے دوبارہ اس پر ترس کھایا، بہر حال! ان کی حکمت کے بھید کون جان سکتا ہے؟ کس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ اور کس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے؟ یہ بات انسان کی عقل سے ماوراء ہے کہ اس کائنات کا نظام کس طرح چل رہا ہے؟ ایک عقل مند انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جائے، اور ہتھیار ڈال دے کہ ہاں! جو آپ کا فیصلہ ہے وہی درست ہے، میں یہ نہیں جان سکتا کہ اس فیصلے کے پیچھے کیا حکمت پوشیدہ ہے، یہ انہی کے فیصلے ہیں کہ بڑے بڑے سرکش اور بڑے بڑے نافرمان ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں، وہ لوگ اس دنیا

میں بڑھ رہے ہیں، ترقی کررہے ہیں، ان کا ڈنکا بج رہا ہے، ان کے پاس دولت آرہی ہے، ان کے پاس ہر قسم کے وسائل موجود ہیں، اور جو اپنے پیارے ہیں، جو اپنے محبوب ہیں، ان کو آروں سے چروایا جارہا ہے، حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کو آروں سے چروادیا، یہ انہی کے فیصلے ہیں، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را چون و چرا نہ رسد در قضاء ما

ہم بعض اوقات اپنے دشمن کو پالتے ہیں، اور اپنے پیاروں کو مروادیتے ہیں، ہمارے فیصلے میں کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں۔

انبیاء علیہم السلام پر بلائیں سب سے زیادہ

ارے انبیاء علیہم السلام سے زیادہ اللہ کے لاڈلے کون ہوں گے؟ لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ

سب سے زیادہ بلائیں اور آزمائشیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں، پھر جو ان سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے ان کے اوپر آتی ہیں۔ اس لئے کائنات میں واقع ہونے والے واقعات کے بارے میں اس کے سواء کوئی چارہ کار نہیں کہ انسان ان واقعات میں اللہ کے فیصلے پر راضی ہوجائے کہ ان کا جو بھی فیصلہ ہے، اس کی حکمتیں وہی جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے، بس ہمارا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور قدرتوں کے آگے سر جھکادیں، اس میں کسی رائے زنی کی گنجائش نہیں، اس کا جو فیصلہ ہے وہ برحق ہے۔

زلزلہ آنے میں حکمت اور مصلحت

اب ہمارے ملک میں چند روز پہلے زلزلہ آیا، یہ کتنی بڑی آفت اور مصیبت تھی، کتنے شہروں میں ہمارے مسلمان بہن بھائی پریشانی کا شکار ہو گئے، اب بظاہر دیکھنے میں اس واقعے میں کوئی خیر کا پہلو نظر نہیں آتا، بظاہر یہ واقعہ برا ہی برا ہے، ہزاروں انسان اس میں شہید ہوئے، ہزاروں انسان زخمی ہوئے، ہزاروں انسان بے گھر ہوئے، لیکن اگر ایک شخص صاحب ایمان ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ کہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ اس واقعے کے پیچھے کیا مصلحتیں کام کر رہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کیا بھلائیاں پیدا کرے گا، اور کائنات کے مجموعی نظام کے اعتبار سے اس کے اندر کیا خیر کا پہلو ہے؟ میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کائنات کا کوئی ذرہ کوئی پتہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہلتا، اور کوئی حرکت اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے بغیر نہیں ہوتی، لہٰذا سر تسلیم خم ہے، جو کچھ ہوا، وہ ان کی حکمت کے عین مطابق ہوا، چاہے ہماری سمجھ میں وہ حکمت آئے، یا نہ آئے، ہم اس پر کوئی رائے زنی نہیں کرتے۔

یہ زلزلہ عذاب تھا یا نہیں؟

اب آج کل اخبارات میں، رسائل میں اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ یہ زلزلہ عذاب ہے یا نہیں؟ ایک قوم کا کہنا یہ ہے کہ یہ عذاب ہے، اور ایک قوم اس کے عذاب ہونے کی نفی کر رہی ہے، خوب سمجھ لیں کہ پورے جزم، وثوق اور یقین کے ساتھ اس زلزلہ کے بارے میں کوئی بات کہنا انسان کے دسترس سے باہر ہے، اس لئے کہ وہ یقین کہاں سے لائے

گا؟ کیا تمہارے پاس وحی آئی تھی؟ لہٰذا کائنات کے ان واقعات کے بارے میں کس بنیاد پر یقین کے ساتھ فیصلہ کر سکتے ہو؟ ارے یہ سارے واقعات تو اس ذات کی طرف سے کنٹرول ہو رہے ہیں جس کے ہاتھوں میں پوری کائنات کی باگ دوڑ ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے، اور وہی جانتا ہے کہ اس فیصلے کے پیچھے کیا اسباب ہیں؟ کیا فائدے اور حکمتیں ہیں؟ یہ سب ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

''تفویض کا'' اختیار کرو

سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کا جو واقعہ بیان فرمایا، وہ یہی بات سمجھانے کے لئے بیان فرمایا کہ جب اس کائنات میں غیر اختیاری واقعات رونما ہوں تو اس میں اپنی عقل دوڑانے کے بجائے اس کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو، اور تفویض کامل اختیار کرو۔ یہاں بھی ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ جزم اور یقین کے ساتھ کوئی رائے زنی نہ کرے، بلکہ یہ کہے کہ ہمیں اس کے بارے میں معلوم نہیں۔ دیکھئے! ایک ہوتا ہے ''عذاب'' جو کافروں پر آتا ہے، اس کا قاعدہ قرآن کریم نے یہ بتایا کہ جب تک کوئی ڈرانے والا ہم ان کے پاس نہیں بھیجتے اس وقت تک ہم کسی پر اس طرح کا عذاب عام جاری نہیں کرتے، اور جو صاحب ایمان ہیں ان کو بھی ان کی بد اعمالیوں کی سزا بعض اوقات اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی دیتے ہیں، جیسے قرآن کریم نے فرمایا:

مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (الشوریٰ: ۳۰)

لیکن وہ عذاب عام کی شکل میں نہیں ہوتا کہ پوری کی پوری قوم ہلاک

ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو عذاب عام سے محفوظ رکھا ہے، ہاں البتہ انفرادی طور پر ایک آدمی، یا ایک قبیلہ، ایک خاندان، یا ایک شہر کے لوگ اپنی کسی بدعملی کی وجہ سے کسی عذاب میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

زلزلہ میں بے شمار فوائد

اب یہ اتنا بڑا زلزلہ آیا، جس میں لاکھوں انسان متأثر ہوئے، اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا متأثر ہونا سزا تھا، کس کا متأثر ہونا بلندی درجات کا سبب تھا، اس لئے کہ بعض اوقات اپنے نیک بندوں کو بھی اس قسم کے مصائب میں ڈال دیتے ہیں، اور اس سے ان کے درجات کی بلندی مقصود ہوتی ہے، ان کو وسعت کے مقام سے سرفراز کرنا مقصود ہوتا ہے، اگر دنیا میں رہتے تو نہ جانے کیا انجام ہوتا۔ کسی کے گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ اللہ تعالیٰ ان مصائب کو بنا دیتے ہیں، کسی شخص کے لئے ان واقعات کو تنبیہ اور تازیانہ بنا دیتے ہیں، کسی کے دل کا حال پلٹنے کے لئے اس کو ذریعہ بنا دیتے ہیں کہ اب تک ایسا منظر اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا، اب تک ایسی آوازیں اپنے کانوں سے نہیں سنی تھیں، اس کے نتیجے میں دل غفلت میں مبتلا تھا، اب وہ آوازیں سن لیں، اور وہ منظر دیکھ لیا، اب دل میں ڈر پیدا ہو گیا، اور تنبیہ ہو گئی، خدا کو معلوم ہے کہ اس واقعے میں کس کس کے لئے کیا کیا مقاصد تھے، کیا کیا فوائد تھے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کئے۔

تخریب کے بعد تعمیر ہوتی ہے

دیکھئے! ایک تخریب ہے، ایک تعمیر ہے، ہر تخریب کے بعد ایک تعمیر ہوتی ہے، بحیثیت مجموعی پورے نظام کائنات کے تناظر میں دیکھا جائے تو بسا

اوقات تخریب ایک تعمیر کا پیش خیمہ بنتی ہے، ایک عمارت منہدم ہوتی ہے، اس کی جگہ دوسری بہتر عمارت کھڑی ہوتی ہے، ایک قوم جاتی ہے، اس کی جگہ دوسری اس سے بہتر قوم آتی ہے، یہ سب فیصلے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی کائنات کے اندر کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ہم جزم اور وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عذاب تھا یا یہ عذاب نہیں تھا، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، ہاں اس بحث میں پڑنے کے بجائے ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم سے متاثرین کی جتنی مدد ہو سکتی ہے، ہم وہ مدد کریں، جان سے، مال سے اور محنت سے جو خدمت ان کی بن پڑے وہ خدمت کریں، جو لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں، ان کے لئے دعاء مغفرت کریں، جو موجود ہیں ان کے لئے دعاء صحت کریں، اور ساتھ ساتھ توبہ و استغفار کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کریں، اور دعا کے ذریعے رجوع کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مزید مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ فرما دے۔

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

اپنے اعمال کے درست کرنے کی فکر کرو، کچھ پتہ نہیں کہ کس عمل کی بدولت اللہ تعالیٰ ہمیں سزا میں مبتلا کر دے، اس لئے یہ سب عبرت حاصل کرنے کے مقامات ہیں، اس عبرت کے ذریعے اپنے حالات کی اصلاح کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔ جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے تو اس میں "رضا بالقضاء" مطلوب ہے کہ جو فیصلہ میرے مالک نے کر دیا، وہی برحق ہے، ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کے سواء کوئی چارہ کار نہیں۔ اس لئے اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ اَغْنَى النَّاسِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھ دیا، چاہے وہ روپے پیسے، دل، یا دنیا

کے دوسرے واقعات ہوں، ان پر راضی ہو جاؤ، اور راضی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے خلاف کوئی شکوہ دل میں نہ ہو، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی حکمت تکوینیہ کے عین مطابق سمجھو:

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

یہ جو کچھ ہو رہا ہے انہی کی حکمت سے ہو رہا ہے، جب ان کی حکمت سے ہو رہا ہے تو تم اس پر راضی ہو جاؤ، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم نے رضامندی اختیار کر لی تو تم لوگوں میں سب سے زیادہ "غنی" ہو جاؤ گے، اس لئے کہ تم نے اپنے فیصلے کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے تابع کر دیا۔ کائنات میں سب کچھ ان کے فیصلے سے ہو رہا ہے۔ اور تمہیں ان کے فیصلوں پر کوئی شکوہ شکایت نہیں، لہٰذا تم سب سے غنی ہو گئے، اور کسی کے محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل کرم سے، اپنی رحمت سے ہمیں رضا بالقضاء عطا فرمائے، اپنے ہر فیصلے پر راضی رہنے کی توفیق عطا فرمائے، اور رضا بالقضا کے جو ثمرات دنیا و آخرت میں ہیں، اللہ تعالیٰ وہ تمام ثمرات ہمیں عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک

ایمان کی علامت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ،وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً۔۔ اما بعدفقد قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم: وَاَحْسِنْ اِلٰی جَارِکَ تَکُنْ مُسْلِمًا۔

تمہید

گذشتہ چار دن سے ایک حدیث کا بیان چل رہا ہے، جس میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کو پانچ نصیحتیں

فرمائیں، اور ساتھ میں یہ ہدایت فرمائی کہ یہ باتیں خود بھی یاد رکھنا، اور ان کو دوسروں تک بھی پہنچانا، خود بھی عمل کرنا، اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ترغیب دینا۔ یہ پانچ نصیحتیں پانچ جملوں پر مشتمل ہیں، پہلا جملہ یہ تھا کہ "اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ" یعنی حرام چیزوں سے، ناجائز چیزوں سے اور گناہوں سے بچو، تو تم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔ دوسرا جملہ یہ تھا کہ "وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ اَغْنَى النَّاسِ" یعنی اللہ جل شانہ نے تمہیں جو کچھ دیدیا ہے، اس پر راضی ہو جاؤ، تو تم تمام انسانوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے، ان دونوں جملوں کا بیان گزشتہ تین دنوں میں ہو گیا۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ "وَاَحْسِنْ اِلٰى جَارِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا" یعنی اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، تو تم مسلمان بن جاؤ گے۔ اس جملے کے ذریعے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ گویا کہ مسلمان کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے، اور اگر کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویدار تو ہو، لیکن اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک نہ کرے تو حقیقت میں وہ مسلمان نہیں، اس لئے آپ نے فرمایا کہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، تو مسلمان بن جاؤ گے، اس جملے میں اس قدر وزنی الفاظ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی، اور قرآن و حدیث پڑوسی کے حقوق اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں۔

جبرئیل علیہ السلام کا مسلسل تاکید کرنا

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام آکر مجھے مسلسل پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں تاکید کرتے رہے، کرتے رہے، کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہوا کہ شاید کوئی حکم ایسا آنے والا ہے کہ پڑوسی بھی وارثوں میں شمار ہو جائے گا، یعنی جس طرح کسی کے مرنے پر اس کی میراث عزیز و اقارب اور رشتہ داروں میں تقسیم ہوتی ہے، شاید کوئی حکم ایسا آنے والا ہے کہ اب پڑوسی کو بھی میراث میں سے حصہ دیا جائے گا۔

پڑوسیوں کی تین قسمیں

قرآن کریم نے پڑوسیوں کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک ''الجار ذی القربی'' دوسرے ''الجار الجنب'' تیسرے ''صاحب بالجنب'' اور تینوں کے حقوق ادا کرنے اور تینوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید فرمائی۔ پہلی قسم ہے ''الجار ذی القربی'' یعنی وہ پڑوسی جس کے گھر کی دیوار آپ کے گھر کی دیوار سے ملی ہوئی ہو، دوسری قسم ''الجار الجنب'' یعنی وہ پڑوسی جس کی دیوار تو نہیں ملی ہوئی ہے، تھوڑا سا فاصلہ ہے، لیکن وہ بھی بالکل قریب ہے۔ دونوں الفاظ علیحدہ لاکر قرآن کریم نے یہ بتادیا کہ یہ مت سمجھنا کہ بس تمہارا پڑوسی وہی ہے جس کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے، بلکہ اگر تھوڑا فاصلہ ہو، لیکن تقریباً ایک ہی جگہ پر رہنے والے ہیں، صرف راستے اور دیواریں الگ ہیں تو وہ بھی تمہارا پڑوسی ہے، اس کا بھی خیال رکھو۔

تھوڑی دیر کا ساتھی

پڑوسی کی تیسری قسم یہ بیان فرمائی کہ "الصاحب بالجنب" میں اس کا ترجمہ یہ کرتا ہوں، "تھوڑی دیر کا ساتھ" اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی سواری میں مثلاً بس میں سفر کر رہے ہیں، اب برابر والی سیٹ پر کوئی آدمی آکر بیٹھ گیا، وہ "صاحب بالجنب" کہلائے گا، یا آپ ریل گاڑی میں یا ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں، برابر والی سیٹ پر دوسرا آدمی بیٹھا ہے، وہ "صاحب بالجنب" ہے، حالانکہ وہ شخص اجنبی ہے، اس سے پہلے کبھی اس کو نہیں دیکھا، نہ اس سے ملاقات ہوئی، اور نہ آئندہ ملاقات ہونے کی امید ہے، لیکن چونکہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہمارے ساتھ ہو گیا ہے، قرآن کریم نے فرمایا کہ اس کا بھی حق ہے، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ یا آپ کہیں لائن میں لگے ہوئے ہیں، اس قطار میں آپ سے آگے ایک آدمی کھڑا ہے، آپ کے پیچھے ایک آدمی کھڑا ہے، یہ دونوں آپ کے "صاحب بالجب" ہیں، اسکے بھی حقوق ہیں، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم ہے۔

اللہ کو وہ بندہ بڑا پسند ہے

قرآن کریم نے پڑوسیوں کی یہ تینوں قسمیں الگ الگ کر کے اس لئے بیان فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کو وہ بندہ بڑا پسند ہے جو اپنے ساتھ رہنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ہو۔ اتنی بات تو ہر مسلمان جانتا اور مانتا ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے، لیکن عملاً چند غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جن کو دور کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ عمل کے وقت نفس و شیطان انسان کو مختلف تاویلیں سمجھا دیتا ہے، اور ساتھ میں دل میں کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دیتا

ہے، جس کے نتیجے میں اس حکم پر عمل کرنے سے محرومی ہو جاتی ہے۔

یہ نئی تہذیب ہے

جب تک مکانات تسلسل کے ساتھ ہوا کرتے تھے، اس وقت لوگ اپنے پڑوسیوں کا لحاظ رکھتے تھے، اس کے ساتھ تعلقات ہوتے تھے، بعض اوقات خون کے رشتوں سے زیادہ قوی تعلق پڑوسیوں کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ لیکن جب سے یہ کوٹھی، بنگلے بننے شروع ہوئے تو اس کے نتیجے میں یہ ہو رہا ہے کہ بسا اوقات رہتے رہتے سالہا سال گزر جاتے ہیں، لیکن یہ پتہ نہیں ہوتا کہ پڑوس میں کون رہ رہا ہے، اس نئی تہذیب نے پڑوسی ہونے کا مسئلہ ہی ختم کر دیا۔ ہم لوگ برنس روڈ پر ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے، اور جس دن اس فلیٹ میں جا کر آباد ہوئے تو آس پاس کے لوگ ملنے کے لئے آگئے، اور آپس میں ایسے تعلقات ہو گئے جیسے عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان ہوتے ہیں، وہاں پانچ سال رہنے کے بعد لسبیلہ ہاؤس میں منتقل ہوئے تو وہاں پر ایک پلاٹ پر والد صاحب نے مکان بنوایا تھا، اس مکان کی چار دیواری تھی، اور چاروں طرف کوٹھی بنگلے والے تھے، اب ہفتوں گزر گئے، لیکن یہ پتہ نہیں چلا کہ داھنی طرف کے مکان میں کون رہتا ہے، بائیں طرف کے کان میں کون رہتا ہے، آگے کون ہے، پیچھے کون ہے؟ نہ کسی سے ملاقات ہے، تو ایک دن والد صاحب نے بڑا اھتمام کر کے برابر والوں کے پاس جا کر ملاقات کی، تا کہ تعلقات قائم ہو جائیں۔ پھر فرمانے لگے کہ دیکھو! جب ہم فلیٹ میں رہنے گئے تھے تو سارے محلے کے لوگ ملاقات کے لئے جمع ہو گئے، اور انہوں نے ہمارا استقبال کیا، اور تعلق اور محبت کا اظہار کیا، اور یہاں یہ صورتِ حال ہے،

علاقوں کے درمیان یہ فرق ہے، بہر حال کوٹھی بنگلوں میں یہی ہوتا ہے کہ سالہا سال رہنے کے باوجود پتہ نہیں چلتا کہ ہمارے پڑوس میں کون رہتا ہے۔

آگ لگنے کا واقعہ

میں ایک مرتبہ اسلام آباد میں ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا، وہ ایک بنگلہ تھا، رات کے ۳ بجے اس میں آگ لگ گئی، اور اللہ تعالیٰ نے خاص فضل فرمایا، اور ہم لوگوں کی جان بچالی۔ فائر بریگیڈ والے آئے، اور انہوں نے آگ بجھائی، لیکن میں نے دیکھا کہ صبح ۸، ۹ بجے تک کارروائی ہوتی رہی، لیکن برابر کے بنگلے والوں کو کوئی خبر نہیں تھی، کسی کو کوئی توفیق نہیں ہوئی کہ یہاں ہمارے پڑوس میں آگ لگ گئی تھی تو پتہ کریں کہ ان کا کیا حال ہے، کوئی مرا، کوئی زخمی ہوا۔ ان کو آنے کی فرصت ہی نہیں تھی، کیونکہ جو مصیبت آئی وہ دوسروں پر آئی، ہمارے اوپر نہیں آئی۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ پڑوس کے ساتھ تعلقات اور حسن سلوک کی فضیلت جو قرآن و حدیث میں بیان فرمائی تھی، وہ ختم ہو چکی، اب تو نفسا نفسی کا عالم ہے، بس میں ہوں، میرا گھر ہے، میرا مکان ہے، میری فیملی ہے، اور بس آگے کسی اور کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

جھونپڑی والا بھی پڑوسی ہے

دوسرے اگر کسی کو پڑوسی کے حقوق اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا کچھ خیال بھی ہے تو پڑوسی اس کو سمجھا جاتا ہے جو مالی اعتبار سے میرا ہم پلہ ہو، اگر میرے برابر میں کوئی جھونپڑی ہے، اور اس میں کوئی شخص رہتا ہے تو وہ پڑوسی نہیں۔ پڑوسی وہ ہے کہ اگر میرا بنگلہ ہے تو اس کا بھی بنگلہ ہو، اگر وہ جھونپڑی

والا ہے تو اس کو پڑوسی کے حقوق دینے کو تیار نہیں، اس کے بارے میں تو خیال ہی نہیں آتا کہ یہ میرا پڑوسی ہے، کیا اس وجہ سے وہ تمہارا پڑوسی نہیں کہ وہ بیچارہ غریب ہے؟ اس کا بنگلہ نہیں، بلکہ اسکی جھونپڑی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم آپس میں پڑوسیوں کا اجتماع کرو گے، اور دعوت کرو گے تو صرف بنگلے والوں کی دعوت کرو گے، جھونپڑی والوں کو دعوت میں شامل نہیں کرو گے، لہٰذا دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ پڑوسی وہ ہے جو مال کے اعتبار سے، منصب کے اعتبار سے، عہدہ کے اعتبار سے، معاشی اعتبار سے میرا ہم پلہ ہو، ورنہ وہ پڑوسی نہیں۔ حالانکہ حقیقت میں پڑوسی وہ ہے جو تمہارے گھر کے پاس رہتا ہو، اگر وہ تمہارے گھر کی دیوار کے ساتھ رہتا ہے تو پہلی قسم کا پڑوسی ہے، اور اگر تھوڑے فاصلے پر رہتا ہے تو دوسری قسم کا پڑوسی ہے، دونوں میں سے ایک میں ضرور داخل ہے، اگر چہ وہ جھونپڑی میں رہتا ہے۔ بلکہ جھونپڑی والے پڑوسی کے حقوق زیادہ ہیں، اس لئے کہ اگر کسی دن اس کے گھر میں کھانے کو نہ ہو تو اس کا پڑوسی گناہ گار ہوگا، بلکہ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ مسلمان نہیں جس کے پڑوس میں کوئی آدمی بھوکا سو جائے۔

مفتی اعظم ہند کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات کئی بار سنی کہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کے فتاوی کی دس جلدیں "فتاوی دار العلوم دیوبند" کے نام سے چھپ چکی ہیں، دار العلوم دیوبند کے "مفتی اعظم" فتوی میں میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے، ان کے

گھر کے قریب تین چار بیوہ خواتین رہا کرتی تھیں، ان کا معمول یہ تھا کہ جب دارالعلوم جانے کے لئے اپنے گھر سے نکلتے تو پہلے ان تمام بیوہ خواتین کے گھر جاتے، اور ان سے پوچھتے کہ بی بی! تمہیں بازار سے کچھ سودا منگوانا ہو تو بتادو، میں لادیتا ہوں، اب کوئی خاتون کہتیں کہ اتنا ہرا دھنیہ، اتنا پودینہ، اتنی سبزی اور اتنے ٹماٹر لے آنا، تمام خواتین سے سودا پوچھتے، پھر بازار جاتے، بازار سے سودا خریدتے، ہر بیوہ کے گھر وہ سودہ پہنچاتے، پھر دارالعلوم تشریف لے جاتے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ کوئی خاتون یہ کہتی کہ مولوی جی! تم غلط سودا لے آئے، میں نے تو فلاں چیز منگوائی تھی، آپ فلاں چیز لے آئے، یا میں نے تو اتنی مقدار میں منگوائی تھی، آپ اتنی لے آئے، فرماتے: اچھا بی بی، کوئی بات نہیں، میں واپس بازار چلا جاتا ہوں، اور ابھی بدلوا کر لے آتا ہوں، چنانچہ دوبارہ بازار جاتے، وہ چیز بدلواتے، پھر لاکر اس بیوہ کے حوالے کرتے، پھر دارالعلوم تشریف لے جاتے، روزانہ کا یہ معمول تھا، ان کا سب سے پہلا کام اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری کرنا تھا۔

یہ کیسے لوگ تھے؟

وہ شخص جس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے، وہ شخص جس کے فتاوی کو اتھارٹی تسلیم کرلیا گیا ہے، دنیا بھر سے لوگ اس کے پاس سوالات کرنے آرہے ہیں، نہ جانے کتنے لوگ ان کے ہاتھ پاؤں چومنے والے موجود ہیں۔ لیکن ان کا یہ حال ہے کہ فتوی کا کام شروع کرنے سے پہلے بیوہ خواتین کی خبر گیری کر رہے ہیں، یہ لوگ ویسے ہی بڑے نہیں بن گئے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کے ذریعے صحابہ کرام کے دور کی

یادیں تازہ کردیں، اور واقعہ بھی یہی ہے، جن علماء دیوبند کے ہم نام لیوا ہیں، یہ محض اس وجہ سے نہیں کہ بس ان سے عقیدت ہوگئی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا ایک ایک فرد سنت نبوی کا جیتا جاگتا پیکر تھا، اور یہ صرف نماز روزے میں نہیں، بلکہ زندگی کے ایک ایک شعبے میں سنت نبوی پر عامل تھا۔

ساری زندگی کچے مکان میں گزاردی

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث تھے، ساتھ میں کتابوں کی تجارت بھی کرتے تھے، مالی اعتبار سے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا، خوشحال تھے، لیکن مکان کچا تھا، جب بارش ہوتی تو ہر بارش کے موقع پر یہ ہوتا کہ کبھی اس مکان کی چھت ٹوٹ جاتی، کبھی اس کی دیواریں کمزور ہو جاتیں، کبھی برآمدہ گر جاتا، اور جب برسات کا موسم ختم ہوتا تو دوبارہ اس کی مرمت کرواتے۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! ہر سال برسات میں مکان میں ٹوٹ پھوٹ ہو جاتی ہے، آپ مشقت اور تکلیف اُٹھاتے ہیں، پھر دوبارہ مرمت کروانی پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسعت دے رکھی ہے، آپ ایک مرتبہ اپنے مکان کو پکا کروالیں، تو یہ بار بار کی تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ چونکہ طبیعت میں ظرافت بھی تھی، اس لئے جواب میں فرمایا: واہ مولوی شفیع صاحب! آپ نے کیا بہترین مشورہ دیا ہے، ہم تو بڈھے ہوگئے، ساری عمر گزر گئی، اور اتنی بات ہماری عقل میں نہیں آئی، واہ، سبحان اللہ! کیا عقلمندی کی بات کہی، ماشاء اللہ۔ اتنی بار انہوں نے یہ جملے دھرائے کہ میں شرم سے پانی پانی ہوگیا، اور بہت

شرمندہ ہوا، والد صاحب نے کہا کہ حضرت! میرے سوال کرنے کا مقصد آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ مکان پکا نہ بنانے میں کیا حکمت ہے؟ جب بہت زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ اچھا میرے ساتھ آؤ، میرا ہاتھ پکڑا، اور گھر کے دروازے پر لے گئے، اور پوچھا کہ:

یہ گلی جو تمہیں یہاں سے نظر آرہی ہے، اس میں تمہیں کوئی پکا مکان نظر آرہا ہے؟ کسی کا مکان پکا نہیں، اب ساری گلی کے تمام پڑوسیوں کے مکان تو کچے ہوں، اور میرا مکان پکا ہو تو پکا مکان بنا کر میاں صاحب کیا اچھا لگے گا؟ اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں کہ ساری گلی والوں کے مکان پکے کرادوں، لہٰذا جیسے میرے پڑوسی ہیں، میں بھی ویسا ہی سہی۔

اس طرح ساری زندگی کچے مکان میں گزار دی، صرف اس لئے کہ پڑوسیوں کے دل میں یہ حسرت نہ ہو کہ میاں صاحب کا مکان پکا ہے، اور ہمارا مکان کچا ہے، حالانکہ مکان پکا بنالینا کوئی گناہ نہیں تھا، نہ شریعت نے منع کیا تھا، نہ حرام قرار دیا تھا، لیکن پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ ان کے دل میں یہ خیال اور یہ حسرت نہ ہو کہ میاں صاحب کا مکان پکا ہے، اور ہمارا مکان کچا ہے۔

تاکہ پڑوسیوں کو حسرت نہ ہو

میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی مرحوم اپنا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ میں ایک مرتبہ حضرت میاں صاحب کے پاس گیا، آموں کا موسم تھا، میاں صاحب نے آم پیش کئے کہ آم کھاؤ، اور اس زمانے میں آم چوس کر کھائے

جاتے تھے، جب چھلکے اور گٹھلیاں جمع ہو گئیں تو میں نے پوچھا کہ ان کو باہر پھینک دوں؟ اور اُٹھا کر دروازے کی طرف چلا، حضرت نے پوچھا کہ کہاں چلے؟ میں نے کہا حضرت باہر پھینکنے کے لئے جا رہا ہوں، حضرت نے فرمایا: نہیں، اس کو باہر مت پھینکو، میں نے پوچھا کیوں؟ انہوں نے فرمایا کہ جب باہر دروازے پر اتنے سارے چھلکے اور گٹھلیاں محلے کے بچوں کو نظر آئیں گی، ان میں سے بہت سے غریب ہیں، جو آم کھانے کی استطاعت نہیں رکھتے تو ہو سکتا ہے کہ ان کو دیکھ کر ان کے دل میں حسرت پیدا ہو، اور یہ حسرت پیدا ہونا اچھی بات نہیں، اس لئے ان کو باہر نہیں پھینکنا، بلکہ چھلکے بکریوں کو کھلا دیتا ہوں۔ یہ ہیں پڑوسیوں کے حقوق، جن کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "وَأَحْسِنْ إِلَى جَارِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا" جس میں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو مسلمان ہونے کی علامت قرار دیا ہے۔

ساتھ کی دکان والا پڑوسی ہے

یہ پڑوسی صرف گھر کی رہائش میں نہیں ہوتا، بلکہ دکان کا بھی پڑوسی ہوتا ہے، اگر آپ کی دکان کے ساتھ دوسرے کی دکان ہے تو وہ بھی آپ کا پڑوسی ہے، اس کے بھی حقوق ہیں۔ لیکن آج کل کمپٹیشن اور مقابلے کا دور ہے، اس لئے برابر کی دکان والے کے ہم پر کیسے حقوق؟ بس ہم کسی طرح اس سے آگے بڑھ جائیں۔ لیکن شریعت کی نظر میں وہ پڑوسی ہے، اور پڑوسی ہونے کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی بنیاد پر وہ تمہارے حسن سلوک کا حقدار ہے، جس معاشرے میں اسلامی تعلیمات کا چلن تھا، جو معاشرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا، وہاں دکان کے برابر والا پڑوسی بھی حقوق

رکھتا تھا، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کا مظاہرہ غیر معمولی طریقے پر ہوتا تھا۔

سبق آموز واقعہ

آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ۱۹۶۶ء کی بات ہے، مکہ مکرمہ میں عمرہ کے لئے میرا جانا ہوا، میرے بڑے بھائی جناب ولی رازی صاحب ساتھ تھے، اس وقت تک مکہ مکرمہ میں قدامت کے آثار باقی تھے، اور ایسی جدت ابھی نہیں آئی تھی، ہم نے وہاں تقریباً دو مہینے قیام کیا، اس وقت جوانی تھی، ہر جگہ جانے اور پرانی اور قدیم جگہیں دیکھنے کا شوق تھا۔ ایک بازار میں ہم گئے تو ایک صاحب جو وہاں جا کر مقیم ہو گئے تھے، انہوں نے بتایا کہ یہاں تو عجیب منظر ہے کہ جیسے ہی اذان ہوئی تو اپنی دکان کو کھلا چھوڑ کر اور سامان پر بس کپڑا ڈال کر نماز کے لئے چلے گئے، کوئی چوری اور ڈاکے کا خطرہ نہیں ہے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ میں نے اس سے زیادہ عجیب حالت دیکھی کہ میں ایک مرتبہ اسی بازار میں ایک دکان والے کے پاس کپڑا خریدنے گیا، میں نے ایک کپڑا دیکھ کر اسے پسند کرلیا، دام پوچھے تو دام بھی مناسب تھے، میں نے کہا کہ اتنا کپڑا پھاڑ دو، دکاندار نے پوچھا کہ آپ کو یہ کپڑا پسند ہے؟ میں نے کہا: ہاں، دام بھی ٹھیک ہیں؟ میں نے کہا: ٹھیک ہیں، پھر دکاندار نے کہا کہ ایسا کریں کہ یہی کپڑا سامنے والی دکان سے لے لیں، میں نے کہا کہ وہاں سے کیوں لوں؟ سودا تو آپ سے ہوا ہے، دکاندار نے کہا کہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آپ کو یہی کپڑا اسی دام میں وہاں سے مل جائے گا، وہاں سے لیلو، میں نے کہا کیا وہ آپ کی دکان ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، میری دکان نہیں ہے، میں نے کہا کہ میرا سودا تو آپ سے ہوا ہے، میں تو آپ ہی سے

لوں گا، اور میں نے کہا کہ جب تک آپ وجہ نہیں بتائیں گے اس وقت تک نہیں لوں گا، دکاندار نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میرے پاس صبح سے لے کر اب تک آٹھ دس گاھک آچکے ہیں، اور سامنے والی دکان میں صبح سے لے کر اب تک کوئی گاھک نہیں آیا، اس لئے میں نے چاہا کہ اس کی بھی بکری ہو جائے، اس لئے تمہیں اس کے پاس بھیج رہا ہوں۔ یہ ہے مسلمان معاشرے کی ایک جھلک جو اس وقت تک باقی تھی۔

آج طلب دنیا کی دوڑ لگی ہوئی ہے

یہ جو آج مصیبت ہمارے اندر آ گئی ہے، کہ بس مجھے مل جائے، دوسرے کو ملے یا نہ ملے، بلکہ دوسرے سے چھین کر کھا جاؤں، دوسرے سے لوٹ کر کھا جاؤں، یہ آفت طلب دنیا کی دوڑ کی وجہ سے آ گئی ہے، اب دیکھئے اوپر والے واقعے میں دکان کے پڑوسی کا خیال ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک ہو رہا ہے۔ وہ مسلمان جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو، جس کے دل میں اللہ کے رسول کی عظمت اور محبت ہو، وہی یہ سلوک کر سکتا ہے، دوسرا شخص یہ عمل نہیں کر سکتا، اس لئے کہ تاجر تو یہ کہتا ہے کہ میں تو یہاں نفع کمانے بیٹھا ہوں، میں اپنی دکان کی بکری کرنے کے لئے بیٹھا ہوں، دوسروں کی دکان کی بکری کرنے کے لئے نہیں بیٹھا ہوں۔ لیکن جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ایمان رکھتا ہو کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تو تم مسلمان ہو جاؤ گے۔ وہی شخص اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کر سکتا ہے، دوسرا نہیں کر سکتا۔

برصغیر میں اسلام کی ابتداء کس طرح ہوئی؟

ہم اپنی برصغیر کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اس علاقے میں

اسلام کی جو روشنی آئی، اور یہاں اللہ تعالیٰ نے اسلام کا جو نور پھیلایا، درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کا نتیجہ تھا، یہاں پر ابتداء میں کوئی اسلامی لشکر اس علاقے کو فتح کرنے کے لئے نہیں آیا تھا، اور یہاں کوئی تبلیغی جماعت نہیں آئی تھی، جس نے تبلیغ کر کے لوگوں کو مسلمان بنایا ہو، بلکہ یہاں پر سب سے پہلے مالابار کے علاقے میں بعض تابعین، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ صحابہ بھی مالابار کے ساحل پر اترے، اور وہاں پر انہوں نے اپنی تجارت شروع کی، اور اس تجارت میں انہوں نے جس سچائی کا، اور جس امانت داری کا، دیانت داری کا اور انسان دوستی کا ثبوت دیا تو اس سے لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچنا شروع ہو گئے، اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات آئی کہ جو دین ان کو یہ باتیں بتا رہا ہے، اس دین کو ہمیں بھی قبول کرنا چاہئے، چنانچہ ان تاجروں کو دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہوئے، اور اس طرح سب سے پہلے اسلام مالابار میں آیا، پھر مالابار سے پورے برصغیر میں اسلام پھیلا۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ جو فرما رہے ہیں کہ پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تو تم مسلمان بن جاؤ گے، یعنی تمہارے مسلمان ہونے کا ایک مظاہرہ دنیا کے سامنے آئے گا، تو اللہ تعالیٰ ان کو اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

دیوار پر شہتیر رکھنے کی اجازت

بہر حال! پہلی قسم کا پڑوسی وہ ہے جس کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہو، اور دوسری قسم کا پڑوسی وہ ہے جو ذرا فاصلے پر ہو، لیکن قریب ہی ہو، دونوں کے حقوق ہیں، ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارا پڑوسی اپنا شہتیر تمہاری دیوار پر رکھنا چاہے تو اس کو منع مت کرو،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ حدیث لوگوں کو سنا رہے تھے تو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیوار ہماری ہے، ہماری ملکیت ہے تو کیا یہ ہمارے اوپر فرض ہے کہ ہم پڑوسی کو اس کے اوپر شہتیر رکھنے سے منع نہ کریں، ان کی حیرانگی کو دیکھ کر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، چاہے تمہیں کتنا برا لگے، لیکن میں اس ارشاد کو تمہارے کندھوں کے درمیان پھینک کر رہوں گا۔ مطلب یہ تھا کہ میں تمہیں یہ ارشاد سنا کر رہوں گا۔ حالانکہ اپنی دیوار پر پڑوسی کے شہتیر رکھنے کی اجازت دینا فرض و واجب نہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ترغیب دی کہ اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں یہ کام کرنا چاہئے۔

پڑوسی کے حقوق میں غیر مسلم داخل ہے

ایک بات اور سمجھ لیں کہ پڑوسی کے حقوق میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں، یعنی پڑوسی ہونے کی حیثیت سے اگر غیر مسلم آپ کے مکان کے برابر میں رہتا ہے تو اس کا بھی یہی حق ہے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، لہٰذا بعض اوقات یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تو کافر ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک کیوں کریں؟ یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ پڑوسی ہونے کے ناطے اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا تمہارے لئے باعث اجر و ثواب ہے، اور اگر پڑوسی ہونے کی بنیاد پر تم نے اس کے ساتھ حسن سلوک کیا، اور اس کو ہدیہ تحفہ بھیج دیا، اس کی کوئی مدد اور تعاون کر دیا تو یہ سب اللہ جل شانہ کی رضا کے مطابق ہے، اور کیا بعید کہ تمہارے حسن سلوک کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایمان ڈال دے، نہ جانے کتنے غیر مسلم تھے، مسلمانوں کے پڑوس

ہونے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرما دی۔ لہٰذا پڑوسی چاہے مسلمان ہو، یا غیر مسلم ہو، غریب ہو، یا امیر ہو، یا فاسق و فاجر ہو، وہ بھی اپنے فسق فجور کی وجہ سے پڑوسی ہونے کے حقوق سے محروم نہیں۔ ہاں! حسب موقع، مناسب وقت پر اس کو نیک باتوں کی تلقین کرتے رہو۔

تھوڑی دیر کا ساتھی

پڑوسی کی تیسری قسم ہے ''صاحب بالجنب'' یعنی تھوڑی دیر کا ساتھی، جیسے بس میں، جہاز میں، ریل گاڑی میں آپ کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے والا صاحب بالجنب ہے، یا کسی مجلس میں، مسجد میں، درسگاہ میں، کلاس میں جلسہ گاہ میں تمہارے قریب بیٹھنے والے یہ سب صاحب بالجنب ہیں۔ ہم ذرا اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم اسلامی تعلیمات سے کتنی دور چلے گئے ہیں، ریل میں سفر کرتے وقت اور جہاز میں سفر کرتے وقت آپ کو یہ نظر آئے گا کہ ہر جگہ خود غرضی کا رجحان ہے، مجھے اچھی جگہ مل جائے، چاہے دوسرے کو ملے یا نہ ملے، مجھے راحت مل جائے، دوسرے کو راحت ملے یا نہ ملے، عام طور پر یہ مزاج بن گیا ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جو شخص صاحب بالجنب ہے، وہ تمہارا ساتھی ہے، چاہے تھوڑی دیر کے لئے ساتھی بنا ہو، لیکن اس ساتھی کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔

اہل مغرب کی ایک اچھی صفت

آج ہم لوگ اہل مغرب کو برا بھلا تو بہت کہتے رہتے ہیں، وہ ہیں بھی اسی لائق کہ ان کو ایسا کہا جائے، لیکن کچھ صفات ایسی ہیں، جو ان لوگوں نے مسلمانوں والی اپنالی ہیں۔ یہ دنیا دار العمل اور دار الاسباب ہے، جو شخص بھی

کوئی سبب اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں اچھا نتیجہ دیں گے۔ چنانچہ اہل مغرب کا ایک مزاج ہے کہ کسی ایک کام کے لئے اگر تین آدمی کسی ایک جگہ جمع ہو جائیں گے تو فوراً قطار اور لائن بنالیں گے، مثلاً اگر ٹکٹ خریدنا ہے، یا بس میں، یا ریل میں، یا جہاز میں سوار ہونا ہے، تو لائن بنا کر سوار ہوں گے، اگر تین آدمی جمع ہو گئے، تو خود بخود لائن بنالیں گے، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کریں گے، یہ وہاں کا عام مزاج ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں کبھی ان کے درمیان لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا، نہ کبھی چھینا جھپٹی ہوتی ہے، نہ دھینگا مُشتی ہوتی ہے، سب کام آرام سے ہو جاتے ہیں، پوری قوم کا یہ مزاج بن گیا ہے۔

ہماری ''خود غرضی'' کا واقعہ

میں اپنا واقعہ بتاتا ہوں، ایک مرتبہ مجھے پی آئی اے کے طیارے میں نیویارک سے کراچی آنا تھا، جس مرحلے تک گوروں کی حکمرانی تھی وہاں تو ہر جگہ لائن لگی ہوئی تھی، لائنوں سے گزرتے ہوئے سب کام ہو گئے، لیکن جب بس میں بیٹھنے کا موقع آیا تو وہ چونکہ ہمارے پاکستانی بھائیوں کے انتظام میں تھا۔ بارش ہو رہی تھی، اور جہاز لیٹ ہو گیا تھا، اس لئے بسوں کے ذریعے ہوٹل جانا تھا۔ اب بس میں بیٹھنے کے لئے جو دھکم پیل ہوئی کہ الامان الحفیظ، کمزور آدمی کا تو بس میں داخل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہر آدمی یہ چاہتا تھا کہ میں دوسروں کو پیچھے دھکیل کر پہلے بس میں سوار ہو جاؤں۔ میں نے دل میں کہا کہ وہ کافر تھے، اور یہ ماشاء اللہ مسلمان ہیں۔ یہ ہے ''خود غرضی'' کہ مجھے پہلے موقع مل جائے، میں سوار ہو جاؤں، میرا کام ہو جائے، میں آگے بڑھ جاؤں، دوسروں کو پیچھے چھوڑ دوں، یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم نے ان باتوں کو دین سے خارج

کردیا ہے، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دین صرف نفلیں پڑھنے اور تسبیح پڑھنے کا نام ہے۔

مصافحہ کرنے پر ایک واقعہ

اور دیکھئے! مصافحہ کرنا کوئی فرض واجب نہیں، زیادہ سے زیادہ سنت ہے، اس مصافحہ کے لئے کسی مسلمان کو تکلیف دینا، نقصان پہنچانا، دھکے دینا حرام ہے، ایک حرام کام کر کے ہم سنت پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ صوبہ سرحد کے ایک علاقے میں جانا ہوا، وہاں کی مسجد میں اجتماع ہوا، اور میرا بیان ہوا، دروازے اس مسجد کے چھوٹے تھے، دونوں طرف کھڑکیاں تھیں، برآمدہ بھی تھا، صحن بھی تھا، لوگ دور دور سے بیان سننے کے لئے آئے ہوئے تھے، مسجد کا ہال، برآمدہ اور صحن سب لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب بیان ختم ہوا، اور مصافحے کی نوبت آئی، میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ برآمدے اور صحن کے لوگ کھڑکیوں کے ذریعے اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے، اور اس کے نتیجے میں مسجد کی کھڑکیاں ٹوٹ گئیں۔ مقصد ان کا صرف یہ تھا کہ مصافحہ کرنے کا موقع نہ نکل جائے، دماغ میں یہ بات تو بیٹھی ہوئی تھی کہ مصافحہ کرنا سنت ہے، اور مصافحہ کرنے کی فضیلت دل و دماغ میں تھی، لیکن یہ ذہن سے نکل گیا کہ مسجد میں دھکم پیل کرنا، اور دوسروں کو اذیت دینا حرام ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہماری قوم کی صحیح تربیت نہیں ہوئی، اس کے نتیجے میں یہ فساد پھیلا ہوا ہے۔

حجر اسود پر دھکم پیل

حجر اسود پر جا کر دیکھیں، کیا ہو رہا ہے، سارے علماء اور فقہاء یہ مسئلہ لکھ لکھ کر چلے گئے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا بڑی فضیلت کی چیز ہے، لہٰذا کسی شخص کو تکلیف پہنچائے بغیر بوسہ دے سکتے ہو تو دیدو، ورنہ بوسہ دینا کوئی ضروری

نہیں، فرض وواجب نہیں۔ مگر آج وہاں دھکم پیل ہو رہی ہے، دوسروں کو تکلیف دی جارہی ہے، اور اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے گناہ کا ارتکاب کیا جارہا ہے، یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ آج دین کے تصور میں یہ باتیں داخل ہی نہیں کہ دوسرے کو تکلیف دینا کوئی گناہ کا کام اور حرام ہے۔ بہر حال! اگر ہم سب مل کر ایک کام کے لئے گئے ہیں تو ہم سب ایک دوسرے کے لئے "صاحب بالجنب" ہیں، ہر ایک کے دوسرے پر حقوق ہیں، اگر لائن بنالو گے تو سب کو موقع مل جائے گا، مگر اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں۔

ایک سنہری بات

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک سنہری بات فرمایا کرتے تھے، جو دل پر نقش کرنے کے قابل ہے، فرمایا کرتے تھے کہ: باطل میں تو اُبھرنے کا دم ہی نہیں، قرآن کریم نے فرمادیا: إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل: ۸۱) باطل تو مٹنے کے لئے اور دبنے کے لئے آیا ہے، وہ کبھی ابھر نہیں سکتا۔ اور اگر تم کسی باطل قوم کو دیکھو کہ وہ دنیا میں اُبھر رہی ہے، ترقی کر رہی ہے، تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے، اس حق چیز نے اس کو اُبھار دیا ہے، ورنہ باطل میں اُبھرنے کی طاقت نہیں تھی۔ آج ہم امریکہ کو، برطانیہ کو اور مغربی طاقتوں کو جتنا برا بھلا کہتے رہیں، ان پر لعنتیں بھیجتے رہیں، لیکن ان کی ترقی ان کی فحاشی اور عریانی کی وجہ سے نہیں، ان کے غلط عقائد کے وجہ سے نہیں، بلکہ ان کی ترقی ان صفات کی وجہ سے ہے، جو درحقیقت اسلام کی بتائی ہوئی صفات تھیں، انہوں نے ان صفات کو اختیار کرلیا۔ مثلاً محنت، جفاکشی، دیانت داری، تجارت میں امانت داری، اور انسانوں کے حقوق کا خیال رکھنا، یہ سب باتیں وہ ہیں جس

نے ان کو دنیا میں ترقی دیدی۔ آخرت میں تو ان کا کوئی حصہ نہیں۔ لیکن دنیا میں اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ یہ معاملہ فرماتے ہیں کہ جو شخص جیسا سبب اختیار کرے گا ویسا اس کو دنیا میں پھل مل جائے گا۔

اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ

بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے دین کو خانوں میں بانٹ رکھا ہے، ایک قوم نے ایک خانے کو لے لیا، اور اس کو دین سمجھ لیا، اور اس خانے سے باہر کی بات اس کے نزدیک دین نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً" اے ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ یہ نہیں کہ رمضان المبارک میں تو خوب نفلیں بھی پڑھیں، اعتکاف بھی کیا، رات کو جاگ بھی لیا، تلاوت بھی کر لی، جب رمضان ختم ہوا اور مسجد سے باہر نکلے تو قصائی بن گئے، لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے میں، معاشرت میں خیانت کرنے لگے، آج کی دنیا کرپشن سے بھری ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں ہم پر عذاب نہیں آئے گا تو کیا آئے گا؟ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، آمین۔ بہر حال! اس حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرما رہے ہیں کہ تم خود بھی ان باتوں کو سنو، اور دوسروں تک پہنچاؤ، اگر تم مسلمان بننا چاہتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

دوسروں کیلئے پسندیدگی کا معیار

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرّم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوسروں کیلئے پسندیدگی کا معیار

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُفَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:وَاَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ۔

تمہید

ایک حدیث کا بیان کئی روز سے چل رہا ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ نصیحتیں فرمائیں، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ تاکید فرمائی کہ وہ خود ان باتوں کو سمجھیں اور عمل کریں، اور دوسروں تک بھی اس کو پہنچائیں، ان میں سے تین نصیحتوں کا بیان گذشتہ دنوں میں ہوا، اللہ

تعالیٰ ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھی نصیحت یہ فرمائی کہ:

وَاَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ

یعنی دوسروں کے لئے وہی بات پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ ان نصیحتوں میں سے ایک ایک نصیحت اتنی جامع، اتنی مانع اور ہمہ گیر ہے کہ اگر انسان کو ان پر عمل کی توفیق ہو جائے تو اس کی ساری زندگی سنور جائے، یہ نصیحت بھی انہی میں سے ہے کہ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایک ایسا معیار عطا فرمادیا کہ اس کے ذریعے معاشرت کے جتنے اسلامی احکام ہیں، وہ سب اس ایک جملے کے اندر آجاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے وہ عقائد اور عبادات کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق معاملات سے بھی ہے، معاشرت سے بھی ہے، اخلاق سے بھی ہے، اور دین کا ایک بہت بڑا باب ''معاشرت'' ہے، یعنی آپس میں ملنے جلنے میں اور آپس میں رہنے سہنے میں کیا آداب ہونے چاہئیں؟ کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزاری جائے؟ یہ معاشرت کا باب ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاص طور پر اپنی مجددانہ تعلیمات میں ''معاشرت'' کو بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔

مجھے اس سے نفرت ہو جاتی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تک فرمایا کہ میرے مریدین

اور متعلقین میں سے کسی کے بارے میں جب مجھے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے ذکر، تسبیح یا نوافل کے معمولات میں کوتاہی کی ہے تو اس سے رنج ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اگر مجھے یہ پتہ چلے کہ کسی نے معاشرتی احکام میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی کی ہے تو اس سے مجھے نفرت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ معاشرتی احکام کا تعلق حقوق العباد سے ہے، جن کے بارے میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان میں کوتاہی کا ارتکاب کرلے تو یہ گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا، جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، اس لئے معاشرتی احکام کی خلاف ورزی بڑا سنگین معاملہ ہے۔

مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے

بہر حال! معاشرتی احکام کا ایک بہت بڑا باب ہے، چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''آداب معاشرت'' کے نام سے ایک پورا رسالہ لکھا ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو لوگ تربیت کے لئے تھانہ بھون جایا کرتے تھے، ان کے لئے معاشرت کے احکام پر پابندی کا بہت اہتمام ہوتا تھا، اسی لئے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کو صوفی بننا ہو تو کہیں اور چلا جائے۔ (صوفی سے مراد جس کو عرف عام میں ''صوفی'' کہتے ہیں) اور اگر کسی کو ''آدمی'' بننا ہو تو وہ یہاں آجائے، کیونکہ وہاں اس بات کو دیکھا جاتا تھا کہ اس کے نشست و برخاست کے انداز میں، اس کے ملنے جلنے کے طریقہ کار میں اسلامی احکام جھلک رہے ہیں یا نہیں؟ یا ان کی خلاف ورزی ہو رہی ہے؟ بہر حال! معاشرت دین کے احکام کا عظیم باب ہے، اب اگر معاشرت کے سارے احکام کا خلاصہ نکالنا چاہیں تو یہ حدیث ''اَلْمُسْلِمُ مَنْ

سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَ يَدِهٖ" اس کا خلاصہ ہے، یعنی تمہاری ذات سے دوسرے مسلمان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے، نہ جسمانی تکلیف پہنچے، نہ روحانی تکلیف پہنچے، نہ نفسیاتی تکلیف پہنچے، نہ ذہنی تکلیف پہنچے، وہ ہے مسلمان، اور اس کی ذات ی بھی طرح سے دوسروں کے لئے تکلیف کا سبب نہ بنے، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ "معاشرت" کے سارے احکام اسی حدیث کے گرد گھومتے ہیں کہ آدمی اس کا اہتمام کرے کہ مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

ہر کام کو اس معیار پر تولو

آدمی جو بھی کام کرے اس میں اس بات کا لحاظ کرے کہ میرے اس کام سے دوسرے کو تکلیف تو نہیں پہنچ رہی ہے؟ اگر اس کا لحاظ کر لیا تو سارے معاشرتی احکام کی پابندی ہو گئی، اور سارے حقوق العباد ادا ہو گئے، لیکن اس کا پتہ کیسے لگایا جائے کہ مجھ سے دوسرے کو تکلیف پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ اس کا معیار یہ حدیث ہے کہ "اَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ" "دوسروں کے لئے وہی بات پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، ہر چیز کو اس معیار پر تول کر دیکھو تو پتہ چلے گا کہ دوسرے کو تکلیف پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ اگر دوسرے کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس کام کو چھوڑ دو۔

کھانے کے بعد پان کھانا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں تو اس قسم کا تصوف ہے، اگر مراقبے اور مجاہدے والا تصوف چاہتے ہو تو کہیں اور چلے جاؤ، ہمارے یہاں تو اسی کی تربیت دی جاتی ہے کہ ایک انسان دوسرے

انسان کے لئے باعث تکلیف نہ بنے، میں نے یہ واقعہ آپ حضرات کو پہلے بھی سنایا تھا کہ میرے بھائی جناب محمد ذکی کیفی مرحوم، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ جب یہ بچے تھے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں والد صاحبؒ کے ساتھ جایا کرتے تھے، حضرت والا بچوں سے بہت پیار کیا کرتے تھے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہر سال رمضان تھانہ بھون میں بچوں کے ساتھ گزارتے تھے، بچے چونکہ قواعد وضوابط سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، اس لئے بڑے بڑے لوگ تو خانقاہ میں قیام کے دوران اس بات سے ڈرتے تھے کہ کوئی بات حضرت والا کے مزاج کے خلاف نہ ہو جائے، لیکن بچے آزادی سے حضرت والا کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ حضرت والا کا معمول یہ تھا کہ کھانا کھانے کے بعد چونا کتھا اور چھالیہ کے بغیر پان کا پتہ چبالیا کرتے تھے، اس لئے کہ یہ پتہ ہاضم ہوتا ہے، اور نقصان سے خالی ہے، میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی مرحوم کے ذمے یہ کام سپرد تھا کہ تم کھانے کے بعد گھر سے پان لایا کرو، اسی وجہ سے حضرت والا نے ان کا نام "پانی" رکھ دیا تھا۔

پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو

جب بھائی صاحب مرحوم نے لکھنا سیکھا تو حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تم پہلا خط حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھو، چنانچہ والد صاحب نے ان سے خط لکھوا کر حضرت کی خدمت میں بھیجا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جو جواب دیا، اس میں علم کا ایک باب کھول دیا، جواب میں حضرت نے فرمایا کہ:

تمہارا خط ملا، بڑا دل خوش ہوا کہ تم نے لکھنا سیکھ لیا، اب تم اپنے خط کو اور زیادہ اچھا بنانے کی کوشش کرو، اور نیت یہ کرو کہ پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو، دیکھو میں تمہیں ابھی سے ''صوفی'' بنا رہا ہوں۔

جو بچہ ابھی لکھنا سیکھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ٹیڑھا سیدھا لکھے گا، اس وقت اس بچے سے یہ فرما رہے ہیں کہ خط کو درست بناؤ، تاکہ پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو، اور ساتھ میں یہ بھی فرما دیا کہ دیکھو! میں تمہیں ابھی سے ''صوفی'' بنا رہا ہوں، کوئی یہ پوچھے کہ خط درست ہونے سے صوفی کا کیا تعلق؟ اس لئے ہمارے دماغ میں تو یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ جو شخص جتنا بڑا بے ڈھنگا، اتنا بڑا صوفی، جو جتنا غلیظ اور میلا کچیلا، وہ اتنا ہی بڑا صوفی، اور جس کا کوئی کام ڈھنگ کا نہ ہو، وہ اتنا ہی بڑا صوفی۔

مخلوق کی خدمت کے بغیر تصوف حاصل نہیں ہو سکتا

اس جواب کے ذریعے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتا دیا کہ در حقیقت صوفی وہ ہے جو اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت کرے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو تکلیف سے بچایا جائے، اور اللہ کے بندوں کو راحت پہنچائی جائے، اس لئے حضرت نے فرمایا کہ دیکھو! میں تمہیں ابھی سے صوفی بنا رہا ہوں۔ آج کل لوگوں نے خانقاہوں میں رہنے، ریاضتیں کرنے، مجاہدے کرنے، مراقبات، کشف و کرامات کا نام ''تصوف'' رکھ دیا ہے، لیکن حضرت والا نے حقیقت واضح فرما دی کہ اس کا نام ''تصوف'' نہیں۔

زتسبیح و سجادہ و دلق نیست

طریقت بجز خدمت خلق نیست

یعنی محض تسبیح پڑھ لینے، اور مصلّے پر بیٹھ جانے اور گدڑی پہن لینے کا نام تصوف نہیں، بلکہ مخلوق کی خدمت کے بغیر تصوف حاصل نہیں ہوسکتا۔ بہر حال! اصل بات یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو ادنیٰ تکلیف بھی نہ پہنچے۔

اگر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تو!

اس کا معیار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتادیا کہ جب بھی کسی کے ساتھ معاملہ کرو تو اس کو اپنی جگہ پر کھڑا کرو، اور اپنے آپ کو اس کی جگہ پر کھڑا کرو، اور دیکھو کہ اگر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تو مجھ پر کیا گزرتی، میں اس سے خوش ہوتا یا ناخوش ہوتا، مجھے اس سے راحت ملتی یا تکلیف ہوتی، یہ سوچ لو، اب اگر تمہیں اس معاملے سے تکلیف ہوتی تو پھر تم وہ معاملہ دوسرے کے ساتھ نہ کرو۔ یہ جو ہم نے دو پیمانے بنالئے ہیں کہ اپنے لئے کچھ اور دوسرے کے لئے کچھ اور، اس کا راستہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کے ذریعے بند فرمادیا کہ بس! ایک پیمانہ ہونا چاہئے، اپنے لئے بھی وہی پیمانہ اور دوسرے کے لئے بھی وہی پیمانہ۔

فرائض کی پرواہ نہیں، حقوق کا مطالبہ پہلے

ایک شخص کہیں ملازم ہے، یا مزدور ہے، اس کو یہ حدیث تو خوب یاد رہتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو، یہ حدیث تو خوب یاد رہتی ہے، لیکن اس کا خیال نہیں کہ پسینہ بھی نکلا یا نہیں؟ جس کام کے لئے اسے ملازم رکھا تھا، اس

نے وہ کام صحیح طور پر انجام دیا یا نہیں؟ اس کی کوئی پرواہ اور فکر نہیں۔ آج کل مختلف انجمنیں قائم ہیں، پوری دنیا میں ایسی انجمنیں بنی ہوئی ہیں، مثلاً "انجمن تحفظ حقوق مزدوراں"، "تحفظ حقوق ملازمین"، "تحفظ حقوق نسواں" وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے حق کی وصولی کا مطالبہ کر رہا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے، اور میرے ذمے جو دوسرے کا حق ہے، اس کا کوئی خیال نہیں، جو ملازم ہے، وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے میری پوری مزدوری ملنی چاہئے، لیکن میرے ذمے جو آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہے، وہ پورا وقت ملازمت میں دیتا ہوں یا نہیں؟ یا اس میں ڈنڈی مار جاتا ہوں، اس کی طرف بالکل دھیان نہیں، دفتر میں تاخیر سے پہنچ رہے ہیں، اور تاخیر سے پہنچنے کے بعد بھی اپنے فرائض منصبی ادا نہیں کر رہے ہیں، ملازمت کے اوقات کے دوران اپنے ذاتی کاموں میں مصروف ہیں، یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ جو کچھ اپنے لئے پسند کیا، وہ دوسروں کے لئے پسند نہیں کر رہے ہیں، اپنے لئے کچھ اور معیار ہے، دوسروں کے لئے کچھ اور معیار ہے، اگر ان سے کہہ دیا جائے کہ چونکہ اس وقت تم نے وقت پورا نہیں دیا، اس لئے تمہاری تنخواہ وضع کی جائے گی تو اب اس کے خلاف لڑائی اور جھگڑا اور جلسے اور جلوس شروع ہو جائیں گے کہ ملازمین کے حقوق پامال کئے جا رہے ہیں۔

ملازمت میں یہ طریقہ کار ہو

یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ اپنے لئے اور معیار ہے، اور دوسرے کے لئے اور معیار ہے، اپنے فرائض کی طرف تو نگاہ نہیں ہے، بس اپنے حقوق کی طرف نگاہ جا رہی ہے۔ یہ صرف سرکاری ملازمین کے لئے نہیں، بلکہ جو

حضرات علماء مدارس میں پڑھا رہے ہیں، یا مدارس میں ملازم ہیں، ان میں سے کسی اللہ کے بندے کے دل میں شاید ہی یہ خیال آتا ہوگا کہ میری یہ تنخواہ حلال ہو رہی ہے یا نہیں؟ ہمارے یہاں دارالعلوم کراچی میں تو یہ قانون ہے کہ تمام اساتذہ اور ملازمین اپنی آمد و رفت کا وقت لکھ دیتے ہیں، اگر درس میں زیادہ تاخیر ہو تو اس کی تنخواہ خود بخود وضع ہو جاتی ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تھانہ بھون میں جو مدرسہ تھا، وہاں اگرچہ اس قسم کا نظام نہیں تھا، لیکن استاذ خود مہینے کے آخر میں ایک درخواست لکھتا کہ اس ماہ کے دوران مجھے اتنی تاخیر ہوئی تھی، یا میرے اتنے ناغے ہوئے ہیں، اس لئے اتنی تنخواہ میری تنخواہ سے وضع کرلی جائے۔ آج ہر شخص اپنے حقوق کے مطالبے کے نعرے لگا رہا ہے، لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ میں فرائض منصبی میں کتنی کوتاہی کر رہا ہوں۔

تنخواہ گھٹانے کی درخواست

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے، پھر وہاں کے استاذ ہوئے، پھر شیخ الحدیث ہوئے، جب بخاری شریف پڑھاتے ہوئے ایک مدت گزر گئی تو مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت کی تنخواہ بڑھانی چاہئے، ایک مدت سے آپ پڑھا رہے ہیں، اس وقت آپ کی تنخواہ دس روپے ماہوار تھی، لہٰذا آپ کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار کی جاتی ہے۔ جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع پہنچی تو آپ نے باقاعدہ ایک درخواست مجلس شوریٰ کے نام لکھی، اور اس میں لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مجلس شوریٰ نے میری تنخواہ بڑھا دی ہے، لیکن مجھے اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا، اس لئے

کہ پہلے تو میرے قوی مضبوط تھے، وقت بھی زیادہ دیتا تھا، اب تو میرے قوی بھی کمزور ہو رہے ہیں، اور وقت بھی زیادہ نہیں دے پاتا، اس لئے اب میری تنخواہ بڑھانے کے بجائے گھٹائی جائے۔ تنخواہ بڑھانے کی درخواست تو آپ نے دیکھی ہوگی، لیکن وہاں تنخواہ گھٹانے کی درخواست دی جا رہی ہے۔

دو پیمانے بنا رکھے ہیں

جن کے دل میں اللہ کا خوف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی فکر ہوتی ہے، جو یہ جانتے ہیں کہ حقوق کے مطالبے سے پہلے اپنے فرائض کی ادائیگی کا دھیان رکھنا ہے، ان کا یہ مزاج ہوتا ہے۔ آج دنیا میں جھگڑے اس لئے ہو رہے ہیں کہ ہم نے دو پیمانے مقرر کر رکھے ہیں، اگر میں دوسرے کو ملازم رکھا ہوا ہوں تو میں یہ چاہوں گا کہ کس طرح اس کی کھال کھینچ لوں، اور اجرت کم سے کم دوں، اور اگر میں ملازم ہوں تو میں یہ چاہوں گا کہ اجرت مجھے زیادہ سے زیادہ مل جائے، اور کام کم سے کم کروں، اس لئے یہ سارے جھگڑے ہو رہے ہیں، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل ہو جائے کہ اگر تم ملازم ہو تو یہ سوچو کہ اگر دوسرا شخص میرا ملازم ہوتا تو میں اس سے کیا چاہتا، اور اگر تم نے کسی کو ملازم رکھا ہوا ہے تو یہ سوچو کہ اگر میں ملازم ہوتا تو میں اپنے آجر سے کیا چاہتا، وہ ادا کرو۔ اسی طرح میاں بیوی کے جھگڑے ہیں، اس میں زیادہ دخل اس بات کا ہے کہ وہاں پر بھی دو پیمانے ہیں، وہاں پر اس حدیث پر عمل ضروری ہے کہ ان کے لئے بھی وہی پسند کرو، جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، یعنی اگر تم شوہر ہو تو تم یہ دیکھو کہ میں اپنی بیوی سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتا ہوں، اور اس کی کس بات سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے؟ اور

اس کی کس بات سے مجھے راحت پہنچتی ہے؟ پھر تم بھی اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک کرو، جو اس کو راحت پہنچانے والا ہو، تکلیف پہنچانے والا نہ ہو۔ اگر تم بیوی ہو تو تم یہ دیکھو کہ مجھے اپنے شوہر کی کس بات سے اور کس سلوک سے تکلیف پہنچتی ہے؟ اور کس بات سے اور کس سلوک سے راحت پہنچتی ہے؟ پھر بیوی اپنے شوہر کے ساتھ ایسا سلوک کرے جو اس کو راحت پہنچانے والا ہو۔

ساس بہو کے جھگڑے کی وجہ

ساس بہو کے جھگڑوں سے ہمارا پورا معاشرہ بھرا ہوا ہے، بے شمار گھرانے اس فساد کا شکار ہیں، یہ سب کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس حدیث پر عمل نہیں ہو رہا ہے، جب تک ساس صاحبہ بہو تھیں، اس وقت تک وہ اپنی ساس سے کیسے سلوک کی توقع رکھتی تھیں، اور جب خود ساس بن گئیں ہیں تو اب اپنی بہو کے ساتھ کیسا معاملہ کر رہی ہیں، یہ دو پیمانے الگ الگ بنائے ہوئے ہیں کہ اپنے لئے پیمانہ اور ہے، اور دوسرے کے لئے پیمانہ اور ہے، اگر ایک پیمانہ ہو جائے تو یہ سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔

اس طریقے کو ختم کرو

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ☆ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ☆ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ☆

(المطففین: ۱۔۳)

فرمایا کہ افسوس ہے ان لوگوں پر کہ جب اپنا حق لینے کا موقع آئے تو پورا پورا لیں، کوئی کسر نہ چھوڑیں، اور جب دوسرے کو دینے کا وقت آئے تو اس

میں ڈنڈی مار جائیں۔ بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کے ذریعے ایسا معیار بیان فرمادیا کہ جس کے ذریعے ہم اپنے معاشرتی طرزِ عمل کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہورہی ہے؟ بس جہاں غلطی ہورہی ہے اس کو درست کرلو تو اللہ تعالیٰ اس کی برکات ایسی عطا فرمائیں گے کہ ہمارے دین و دنیا سنور جائیں گے۔

میری مخلوق سے محبت کرو

میرے شیخ حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے، تو میری مخلوق سے محبت کرو، تم مجھ سے کیا محبت کروگے، کیونکہ تم نے نہ مجھے دیکھا ہے، نہ تمہارے اندر دیکھنے کی طاقت ہے، اس لئے تم مجھ سے کیا محبت کروگے؟ میری محبت کا عنوان یہ ہے میری مخلوق سے محبت کرو، میرے بندوں سے محبت کرو۔ حضرت والا کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی محبت کسی کے دل میں ڈالتے ہیں تو پھر اس کا معاملہ یہ ہوجاتا ہے کہ ہر مخلوق خدا سے اس کو محبت ہوتی ہے، اس کے دل میں کسی کے خلاف کینہ نہیں ہوتا، اس کے دل میں کسی کے خلاف بغض نہیں ہوتا، جیسے کسی نے کہا کہ:

کفر است در طریقت ِ ما کینہ داشتن

آئینِ ما ست سینہ چوں آئینہ داشتن

اب کسی کے خلاف نہ تو غصہ ہے، نہ کینہ ہے، نہ بغض ہے، نہ عداوت ہے، بلکہ ہر حال میں دوسرے کے حق میں خیر خواہی ہے۔

ایک صحابی کا واقعہ

چنانچہ اپنے بزرگوں کو ہم نے ایسا پایا کہ ان سے تعلق رکھنے والے جتنے لوگ ہوتے تھے، ان میں سے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ان بزرگ کو مجھ سے سب سے زیادہ محبت ہے، اور یہ درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت چلی آرہی ہے، ہر صحابی یہ سمجھتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے زیادہ محبت ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ سب سے محبوب ہی میں ہوں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بہت بعد میں مسلمان ہوئے، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب ہوں، اب سابقین اولین میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و محبت کا انداز دیکھ کر دل میں یہ خیال آیا کہ شاید میں زیادہ محبوب ہوں، اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ بیٹھے کہ یا رسول اللہ! آپ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا ابوبکر صدیقؓ سے زیادہ محبت ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر سے، اس وقت راز کھلا کہ ان کے مقابلے میں ابوبکر سے زیادہ محبت ہے۔ اب دل میں خیال آیا کہ ابوبکر صدیقؓ تو بہت اونچی شخصیت ہیں، ان سے تو آپ کو بہت محبت ہوگی، اب دوسرے نمبر پر میں زیادہ محبوب ہوں گا، لہٰذا پھر سوال کرلیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے زیادہ محبت ہے یا حضرت عمر فاروقؓ سے زیادہ محبت ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر سے، فرماتے ہیں کہ اب مزید سوال کرنے سے میں ڈر گیا کہ اب مزید سوال کروں گا تو پتہ نہیں کون سے نمبر پر جاؤں گا۔ بہر حال! ان کے دل میں خیال

اس لئے آیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ہر ایک صحابی کے ساتھ ایسا تھا کہ ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے زیادہ محبت ہے۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا ہر ایک کے لئے دعا کرنا

ہم نے اپنے بزرگوں میں بھی یہی طرز عمل دیکھا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو، حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کو، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ جتنے متعلقین ہیں، ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ حضرت کو مجھ سے زیادہ محبت ہے، ایسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت دل میں ڈال دی تو اپنی مخلوق کی ایسی محبت دل میں ڈال دی کہ ہر ایک کی خیر خواہی، ہر ایک سے محبت، ہر ایک کا خیال، حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کسی ملنے جلنے والے سے ملاقات ہو جاتی تو فرماتے، ارے بھائی! ہم تمہارے لئے بہت دعا کرتے ہیں، اور روزانہ دعا کرتے ہیں، اب اگر توریہ کریں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب عمومی طور پر تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہوں گے تو تم بھی ان کے اندر داخل ہو جاتے ہو گے۔ لیکن حضرت والا کی یہ مراد نہیں تھی کہ عمومی طور پر اس طرح دعا کرتا ہوں، بلکہ واقعۃً خصوصی طور پر نام لے کر ہر ایک کے لئے دعا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! آپ روزانہ ہر ایک کے لئے کس طرح دعا کرتے ہیں؟ فرمایا کہ میں نے پانچ نمازوں کو تقسیم کر رکھا ہے، مثلاً فجر کی نماز کے لئے یہ طے کر رکھا ہے کہ اپنے جو بڑے ہیں، جیسے والدین، اساتذہ، مشائخ، ان سب کے لئے فجر کی نماز کے بعد دعا کروں گا، ظہر کی نماز کے لئے یہ طے کر رکھا ہے کہ اپنے برابر کے دوست واحباب ہیں، ہم سبق ہیں، ان کے لئے دعا

کروں گا، اور عصر کی نماز کے بعد اپنے سے چھوٹوں کے لئے اور اپنے متعلقین کے لئے دعا کروں گا، مغرب کے بعد اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے لئے دعا کروں گا، اس طرح میں نے پانچ نمازوں کو اپنے ملنے جلنے والوں اور اہل خانہ کے لئے بانٹ رکھا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے اپنے وقت پر ہر ایک کے لئے دعا ہو جاتی ہے، الحمدللہ۔ یہ دعائیں کیوں ہو رہی ہیں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی بدولت اپنی مخلوق کی محبت دل میں ڈال دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دل میں بھی یہ محبت پیدا فرما دے، آمین۔ بہرحال! یہ چوتھی نصیحت تھی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس نصیحت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

پانچویں نصیحت

پانچویں نصیحت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی کہ "لا تکثر الضحک ، فان کثرۃ الضحک تمیت القلب "یعنی بہت زیادہ ہنسا مت کرو، اس لئے کہ کثرت سے ہنسنا دل کی موت کا باعث ہوتا ہے، اس سے انسان کا دل مرجاتا ہے۔ یہاں ہنسنے سے قہقہہ مار کر ہنسنا مراد ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں یہ ہے کہ آپ قہقہہ مار کر نہیں ہنستے تھے، زیادہ تر تو تبسم فرماتے تھے، مسکراتے تھے، بعض روایتوں میں آتا ہے کہ بعض اوقات ہنسنے کے دوران آپ کا منہ کھل جاتا تھا، اور داڑھیں ظاہر ہو جاتی تھیں، لیکن قہقہہ مار کر ہنسنا کہیں ثابت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر وقت ہنسنے ہنسانے میں لگا رہے، اور مسخرہ بن جائے تو یہ پسندیدہ نہیں، البتہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ہنسی

مذاق بھی جائز ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا مذاق کیا ہے۔ بہر حال! یہ اس حدیث کا حاصل ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اور اپنی رحمت سے ہمیں ان پانچوں نصیحتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

چار عظیم صفات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۶

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

چار عظیم صفات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ،وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً۔ اما بعد!عن عبد اللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال:قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:اَرْبَعٌ اِنْ کُنَّ فِیْکَ فَلَا عَلَیْکَ مَافَاتَکَ مِنَ الدُّنْیَا،حِفْظُ اَمَانَۃٍ، وَصِدْقُ حَدِیْثٍ ، وَحُسْنُ خَلِیْقَۃٍ ،وَعِفَّۃٌ فِیْ طُعْمَۃٍ اَوْ کَمَاقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

یہ چار صفتیں بڑی دولت ہیں

ایک حدیث میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول

ہے کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لوگوں کے سامنے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا کہ: اربع ان کن فیك فلا علیك مافاتك من الدنیا، فرمایا کہ چار صفتیں ہیں کہ اگر وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں تو اگر دنیا کی کوئی نعمت تمہیں نہ ملی ہو تو تمہیں اس کا کوئی غم نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ چار صفتیں اتنی بڑی دولت ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی اور دولت کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا یہ چار صفتیں دنیا کی ساری دولت سے بالا وبرتر ہیں، وہ چار صفتیں کیا ہیں؟ فرمایا:

حِفْظُ اَمَانَةٍ، وَصِدْقُ حَدِيْثٍ، وَحُسْنُ خَلِيْقَةٍ، وَعِفَّةٌ فِيْ طُعْمَةٍ

اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

وہ چار صفتیں جو دنیا کی ساری دولتوں سے بڑھ کر دولت ہیں، ان میں سب سے پہلی صفت ''امانت کی حفاظت'' کرنا، دوسری صفت ''بات کی سچائی'' تیسری صفت ''خوش اخلاقی'' اور چوتھی صفت یہ کہ ''جو لقمہ کھا رہے ہو اس کا پاک دامن ہونا'' کہ اس میں حرام کا شائبہ نہ ہو، یہ چار صفتیں بہت مختصر ہیں، لیکن اتنی جامع ہیں کہ سارا دین ان کے اندر سمٹ آیا ہے۔

پہلی صفت: امانت کی حفاظت

پہلی صفت بیان فرمائی کہ ''امانت کی حفاظت'' قرآن وحدیث کے ارشادات اس کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا (النساء:۵۸)

اور حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت میں

خیانت کرنے کو منافق کی خصلت قرار دیا ہے، فرمایا کہ تین باتیں جس کے اندر پائی جائیں وہ پکا منافق ہے، ان میں سے ایک ہے ''وعدہ خلافی'' اور دوسرے ''امانت میں خیانت'' اور تیسرے ''جھوٹ بولنا'' ان تین چیزوں کو آپ نے نفاق کی علامت قرار دیا، مسلمان کا کام نہیں کہ وہ یہ تین کام کرے، بہر حال! ''امانت'' وہ چیز ہے جس کی رعایت سے مسلمان مسلمان بنتا ہے۔

نبوت سے پہلے آپ کے مشہور اوصاف

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم صفت جو عطاء نبوت سے پہلے سے لوگوں میں معروف تھی، وہ صادق اور امین ہونا تھی، یعنی سچائی اور امانت داری، بڑے سے بڑا دشمن بھی اپنی امانت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھوانے کے لئے تیار تھا، یہاں تک کہ جب آپ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرما رہے تھے، اس وقت لوگوں کی امانتیں آپ کے پاس رکھی ہوئی تھیں، ان امانتوں کو ان کے مالکوں تک پہنچانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر فرمایا، یہ آپ کا خاص وصف تھا، جو کافروں میں بھی معروف اور مشہور تھا۔ لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کے ناطے ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ''امانت'' کا خصوصی خیال رکھے۔

امانت کا وسیع مفہوم

لیکن امانت کا مطلب عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی آدمی ہمارے پاس پیسے یا کوئی چیز لا کر رکھوا دے، ہم اس کو صندوقچی میں بند کر کے رکھدیں، اور جب وہ طلب کرے تو اس کو واپس کر دیں، اور خیانت یہ ہے کہ اس کو کھا

جائیں۔ چونکہ جان بوجھ کر اس قسم کی خیانت الحمدللہ سرزد نہیں ہوتی، اس لئے ہم مطمئن ہیں کہ ہم امانت دار ہیں، اور ہم امانت کی حفاظت کر رہے ہیں۔ لیکن امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے، بے شمار چیزیں اس کے اندر داخل ہیں، جس کی پوری تفصیل ایک بیان میں عرض کی تھی، وہ بیان چھپ چکا ہے۔

(اصلاحی خطبات، جلد ۳)

دوسری صفت: بات کی سچائی

دوسری صفت جو اس حدیث میں بیان فرمائی وہ ہے ''صدق حدیث'' بات کی سچائی، یعنی آدمی جھوٹ نہ بولے، غلط بیانی نہ کرے۔ دیکھئے! ایک تو کھلا جھوٹ ہوتا ہے، جس کو ہر ایک جھوٹ سمجھتا ہے، اور دوسرا ہوتا ہے پوشیدہ قسم کا جھوٹ، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جس شخص کو دین کا اور جھوٹ سے بچنے کا تھوڑا بہت دھیان ہے، وہ عام طور پر کھلے جھوٹ سے تو پرہیز کرتا ہے، اور اگر اس کا کسی دینی حلقے سے تعلق ہے تو وہ کھلا جھوٹ بولتے ہوئے ڈرے گا، لیکن جھوٹ کی کچھ شکلیں ایسی ہیں جو ہمارے معاشرے میں سرایت کر گئی ہیں، اور ان کے جھوٹ ہونے اور گناہ ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا، مثلاً یہ کہ ایک آدمی کی بات دوسرے کو نقل کرنے میں بے احتیاطی اور لاپرواہی برتی جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل بات تو کچھ تھی، لیکن آگے نقل ہوتے ہوتے اس کا حلیہ ایسا بگڑا کہ اصل بات سے کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہی، اور غلط بات پھیل گئی، ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ نقل کرتے وقت یہ احتیاط نہیں کی کہ جو بات جس طرح کہی جارہی ہے، وہ بات اسی طرح یاد رکھوں، اور اسی

طرح آگے نقل کردوں، بلکہ سنا کچھ، اور سمجھا کچھ، اور پھر اس میں اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر آگے چلتا کر دیا، اب اس کو جھوٹ بھی نہیں سمجھا جاتا۔

بات کیا سے کیا بن جاتی ہے

میرے پاس تقریباً پانچ دس جگہوں سے خطوط آئے، اور یہ لکھا کہ ایک صاحب اپنی تقریروں میں آپ کی طرف منسوب کر کے یہ مسئلہ بیان کر رہے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ٹیپ ریکارڈر پر قرآن کریم سننا گانے سننے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اب میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ میں نے کبھی یہ مسئلہ یہ بیان کیا ہو، جب میں نے اس میں غور کیا کہ یہ بات کہاں سے چلی ہے تو اندازہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایک مجلس کے اندر میں وعظ کیا، اس مجلس میں سے ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ اگر ٹیپ ریکارڈر پر قرآن کریم کی تلاوت سن رہے ہوں، سجدہ تلاوت آجائے تو سجدہ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ میں نے یہ جواب دیا تھا کہ وہ تلاوت جو ٹیپ ریکارڈر میں ہوتی ہے، وہ حقیقی تلاوت کے حکم میں نہیں ہوتی، لہٰذا اس کے سننے سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔ اب چونکہ میں نے یہ کہہ دیا کہ ٹیپ ریکارڈر کی تلاوت حقیقی تلاوت کے برابر نہیں، تو یہاں سے انہوں نے یہ سمجھا کہ پھر وہ تلاوت حرام اور ناجائز ہے، اور اس کو اپنی طرف سے آگے بڑھا دیا کہ وہ تلاوت گانے سننے سے بدتر ہے، اور یہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا، بلکہ بے احتیاطی اور لاپرواہی سے اپنے خیالات کو اس میں داخل کر دیا۔

میری طرف منسوب ایک خواب

ابھی چند روز پہلے جناب بھائی کلیم صاحب مجھے یہ بتا رہے تھے کہ جن

علاقوں میں زلزلہ آیا ہوا ہے، وہاں میری طرف منسوب ہو کر یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ اس نے ایک خواب دیکھا ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رمضان المبارک کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے زلزلے کو ہلکا کر دیا، اور عید کے بعد اس سے بڑا زلزلہ آئے گا، اب میرے پاس ٹیلیفون آرہے ہیں کہ کیا آپ نے یہ خواب دیکھا ہے؟ خدا جانے یہ بات کہاں سے نکلی، اور کس طرح چلتی کر دی، پہلی بات کا تو کچھ سراغ لگ گیا تھا، اس کا تو کوئی سراغ بھی نہیں ملا کہ کہاں سے نکلی ہو گی۔

نقل کرنے میں احتیاط کریں

غرض یہ کہ بات کو آگے نقل کرنے میں احتیاط ختم ہو چکی ہے، شریعت اور دین نے جتنا اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ آدمی کے منہ سے کوئی بات غلط نہ نکلے، آج اتنی ہی بے احتیاطی ہو رہی ہے، اس کے نتیجے میں فتنے اور فساد پھیل رہے ہیں، افواہیں پھیل رہی ہیں، یا تو بات آگے نقل ہی مت کرو، اور اگر بات آگے نقل کرنی ہے تو خدا کے لئے اپنی جانو پر رحم کھاؤ، اور جو بات دوسروں تک پہنچانی ہے اس کو صحیح صحیح یاد کرو کہ کیا کہا گیا، پھر آگے پہنچاؤ۔

ایک محدث کی احتیاط

علامہ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کتاب ''الکفایہ'' میں ایک محدث کا واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ ایک حدیث سنایا کرتے تھے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حدیث روایت کرنے والے حدیث روایت کرتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں، حدثنا فلان قال: حدثنا فلان قال: حدثنا فلان۔ حدثنا کے معنی ہیں مجھے فلاں نے یہ حدیث سنائی۔ بہرحال! وہ محدث ایک حدیث کو اپنے استاد کی

طرف منسوب کر کے سناتے تو یوں کہتے:

حدثنا فلان قال:ثنا فلان

پورا لفظ "حدثنا" کے بجائے "ثنا" کہتے، لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ لفظ پورا "حدثنا" کیوں نہیں پڑھتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب میں استاد کے درس میں پہنچا تو استاد نے درس شروع کر دیا تھا، اور میرے آنے سے پہلے "حد" کا لفظ کہہ چکے تھے، اور میں نے "حد" کا لفظ ان کی زبان سے نہیں سنا، بلکہ صرف "ثنا" سنا، لہٰذا اب اگر میں آگے روایت کرتے ہوئے پورا لفظ "حدثنا" کہوں گا تو جھوٹ ہو جائے گا، اس لئے میں صرف "ثنا" کہتا ہوں۔ اس احتیاط کے ساتھ یہ احادیث ہم تک پہنچی ہیں، ان حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو محفوظ کرنے میں اتنی احتیاط کی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور احتیاط

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نے حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، آپ خودرائی کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> جب تک تمہارے "ضابطے" کے بڑے موجود ہوں تو ان سے مشورہ کرو، جب وہ نہ رہیں تو برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو، اور جب وہ بھی نہ رہیں تو چھوٹوں سے مشورہ کرو، بغیر مشورہ کے کوئی کام مت کرو۔

پھر خود بھی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''ضابطے'' کے بڑے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں کون بڑا ہے؟ اور کون چھوٹا ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے، اس لئے کہ حقیقت میں بڑائی اور چھوٹائی تقویٰ کی وجہ سے ہے اور اللہ کی اطاعت کی بنیاد پر ہے، لیکن ''ضابطے'' میں ہم دیکھتے ہیں کہ ''باپ'' بیٹے سے بڑا ہے، استاد شاگرد سے بڑا ہے، شیخ مرید سے بڑا ہے، یہ سب ''ضابطے'' کے بڑے ہیں۔ لیکن حقیقت میں کون بڑا ہے، اللہ ہی جانتا ہے۔

حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ حضرت والا یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ جب تک ''بڑے'' موجود ہوں، بڑوں سے مشورہ کرو، لیکن چونکہ دماغ میں وہ ترازو لگا ہوا ہے کہ کوئی بات خلاف واقعہ نہ نکلے، اس ترازو نے صرف ''بڑا'' نہیں کہنے دیا، بلکہ یہ کہلوایا کہ ''ضابطے کے بڑے'' تا کہ بات نفس الامر کے خلاف نہ ہو۔

غفلت اور لاپرواہی بڑی بلا ہے

جب دل میں فکر پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ صحیح لفظ دل میں ڈال دیتے ہیں کہ انسان اس وقت یہ لفظ استعمال کرے، سب سے بڑی ''بلا'' غفلت ہے، بے پرواہی ہے، اس بات سے غفلت کہ میرے منہ سے کیا لفظ نکل رہا ہے، بس جو چاہے الم غلم نکل جائے، کوئی پرواہ نہیں، اس ''بلا'' نے ہمیں ''صدق حدیث'' سے دور کر دیا ہے، ''بات کی سچائی'' یہ ہے کہ جو لفظ منہ سے نکلے وہ تلا ہوا نکلے، وہ سو فیصد صحیح ہو، اس میں اتنا مبالغہ نہ ہو کہ وہ جھوٹ کی حد تک پہنچ

جائے، تھوڑا بہت مبالغہ تو محاورۃً آدمی بول دیتا ہے، لیکن ایسا مبالغہ جو جھوٹ کی حد تک پہنچ جائے، یہ ''صدق حدیث'' کے خلاف ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جب زبان سے کوئی لفظ نکال رہے ہو تو ذرا دھیان سے نکالو۔

اگر آپ کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہو تو

اور اس کا بہترین معیار میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا تھا، اور الحمد للہ دل میں اتر گیا، وہ یہ کہ جب کوئی کلمہ زبان سے کہو، یا قلم سے لکھو تو سوچ لو کہ یہ بات مجھے کسی عدالت میں ثابت کرنی ہے، آپ ذرا اس کا تجربہ کریں کہ اگر آپ کو یہ بتا دیا جائے کہ آج آپ ان دو گھنٹوں کے درمیان جو بات کریں گے وہ ریکارڈ ہو کر تھانے میں پیش ہوگی، اور اس کی بنیاد پر آپ کو گرفتار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا، پھر بتاؤ کہ ان دو گھنٹوں میں کس طرح گفتگو کرو گے؟ کیا اس وقت بھی بے سوچے بولتے چلے جاؤ گے، یا زبان پر کوئی قدغن لگے گی؟ اس وقت اگر تم سے کوئی بات کرنا چاہے گا تو تم کہو گے کہ ارے بھائی اس وقت تو میری ہر بات ریکارڈ ہو رہی ہے، اور اسی پر میری گرفتاری اور رہائی کا فیصلہ ہونا ہے، لہٰذا اس وقت مجھ سے ایسی فضول باتیں نہ کرو، نہ کرواؤ، اس وقت تمہارے منہ سے کیسے موتی کی طرح تلے ہوئے الفاظ نکلیں گے۔

ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ ارے بھائی! یہ ٹیپ ریکارڈر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کے لئے لگا ہوا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

مَایَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّالَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (سورۃ ق:۱۸)

اور اسی ٹیپ ریکارڈر کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا کہ تم سچ بول رہے تھے، یا جھوٹ بول رہے تھے، لہٰذا جب اس وقت بولنے میں احتیاط کرتے تو اب یہ سوچ کر احتیاط کرلو کہ ایک ایک لفظ جو منہ سے نکل رہا ہے آخرت میں اس کی جواب دہی ہونی ہے، لہٰذا سوچ سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے منہ سے بات نکالو، جن لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ہوتی ہے وہ بولنے میں بہت احتیاط کرتے ہیں، صرف ضروری بات ہی زبان سے نکالتے ہیں، ورنہ وہ خاموش رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں "امانت داری" بھی عطا فرمائیں، اور "صدق حدیث" بھی عطا فرمائیں کہ جو بات منہ سے نکلے، وہ سو فیصد درست ہو۔

تیسری صفت: خوش اخلاقی

تیسری صفت جو اس حدیث میں بیان فرمائی وہ ہے "حسن خلیقة" یعنی خوش اخلاقی، ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "مؤمن خوش اخلاق ہوتا ہے، بد اخلاق، کینہ پرور، لوگوں کے ساتھ درشت کھردرا معاملہ کرنے والا نہیں ہوتا، یہ ایک مسلمان کی شان نہیں، مسلمان تو دوسرے لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرتا ہے، سختی کا برتاؤ نہیں کرتا۔

خوش اخلاقی کیا چیز ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ "خوش اخلاقی" کیا چیز ہے؟ اور کس طرح پیدا

ہوتی ہے؟ یہ طویل الذیل موضوع ہے، مختصر وقت میں بیان کرنا مشکل ہے، مختصر بات یہ ہے کہ خوش اخلاقی صرف اس کا نام نہیں کہ آپ نے ظاہری طور پر دوسرے سے مسکرا کر بات کرلی، یہ بھی بیشک خوش اخلاقی کا ایک حصہ ہے، لیکن اگر ظاہری طور پر تو آپ مسکرا کر بات کررہے ہیں، اور دل میں بغض بھرا ہو ہے، یہ تو خوش اخلاقی کا مصنوعی مظاہرہ ہوا، جس میں اخلاص نہ ہوا، بلکہ ایک بناوٹی کارروائی ہوئی، جو ایک مؤمن کے لئے زیبا نہیں۔

مغربی ممالک اور خوش اخلاقی

آج کل مغربی ممالک میں اس موضوع پر بہت کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں؟ اور لوگوں کو کس طرح اپنی طرف مائل کریں؟ لوگ ایسی کتابوں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں، ان کتابوں میں یہ لکھتے ہیں کہ جب لوگوں سے ملو تو اس طرح ملو، جب باتیں کرو تو اس طرح باتیں کرو، اس طرح لوگوں کے ساتھ پیش آؤ، یہ خوش اخلاقی کا طریقہ ہے۔ لیکن اس خوش اخلاقی کا مطلب صرف یہ ہے کہ دوسرے کے دل کو اپنے حق میں کیسے مسخر کریں؟ دوسرے کے دل میں اپنی عظمت کیسے پیدا کریں؟ بس اس کے لئے خوش اخلاقی کے سارے طریقے اختیار کیے جارہے ہیں، وہ خوش اخلاقی جو "دین اسلام" کے اندر مطلوب ہے، اور جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمایا، اس خوش اخلاقی کا مقصد دوسرے کو مسخر کرنا نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ایک مسلمان کے میرا فرض ہے کہ میں دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤں، لہٰذا دونوں مقصد میں زمین وآسمان کا

فرق ہے، اس لئے کہ وہاں جو خوش اخلاقی ہورہی ہے، وہ لوگوں کو اپنا بنانے کے لئے ہورہی ہے، اپنا گاہک بنانے کے لئے ہورہی ہے، مارکیٹنگ کے لئے ہورہی ہے، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خوش اخلاقی مطلوب ہے، وہ خوش اخلاقی دوسروں کو مسخر کرنے کے لئے نہیں، بلکہ خود اپنے فائدے کے لئے ہے کہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بھی ایک صدقہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو، تاکہ میرا اللہ راضی ہوجائے۔

تجارتی خوش اخلاقی

آج کل لوگ مغربی قوم کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ یہ بڑے خوش اخلاق ہیں، اور ان کی خوش اخلاقی کی تعریف کرکے بسا اوقات مسلمانوں اور اسلام کے مقابلے میں ان کی برتری دل میں آنے لگتی ہے۔ ٹھیک ہے، بعض لوگ حقیقی معنوں میں خوش اخلاق ہوتے ہوں گے، لیکن عام طور پر ان کی خوش اخلاقی تجارتی ہے، وہ مارکیٹنگ کی خوش اخلاقی ہے، ایک سیلز مین جو ایک دکان پر کھڑا ہوا ہے، وہ اگر اپنے گاہکوں سے مسکرا کر بات نہ کرے، اور خوش اخلاقی سے پیش نہ آئے تو کون اس کا سامان خریدنے آئے گا، وہ تو اپنی تجارت کی خاطر اور اپنے نفع کی خاطر لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے پر مجبور ہے، لیکن اگر آپ اس سے یہ کہہ دیں کہ تم میرے ساتھ بڑے خوش اخلاقی سے پیش آرہے ہو، تو میرے لئے دس روپے کم کردو، تو پھر وہ ساری خوش اخلاقی رخصت ہوجائے گی، اس لئے کہ وہ ساری خوش اخلاقی تو اس

لئے ہو رہی ہے کہ میں اس سے زیادہ سے زیادہ پیسے کھینچ لوں، اور اپنا سامان اس کو فروخت کروں، یہ کیا خوش اخلاقی ہوئی؟ خوش اخلاقی وہ ہے جو انسان کے دل سے اٹھے اور جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے ہو، جس کا مقصد آخرت کی فلاح ہو، دنیا کے اندر اس کا صلہ مطلوب نہ ہو، یہ ہے ''خوش اخلاقی''۔

خوش اخلاقی کیسے پیدا ہوگی؟

یہ خوش اخلاقی کیسے پیدا ہوگی؟ یہ سارا ''تصوف اور سلوک'' درحقیقت اسی خوش اخلاقی کو پیدا کرنے کا علم ہے، لوگ بزرگوں کی صحبت میں جو جاتے ہیں، وہ درحقیقت اسی خوش اخلاقی کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے جاتے ہیں، اس کا ایک پورا انتظام ہے، جس کو اس وقت پوری تفصیل سے بیان کرنا تو ممکن نہیں، لیکن میرے نزدیک خوش اخلاقی کی جو کلید ہے، وہ اس وقت عرض کر دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ خوش اخلاقی کی بنیادی کنجی اگر حاصل ہو گئی تو خوش اخلاقی حاصل ہو گئی، وہ ہے ''تواضع'' یہ ساری خوش اخلاقی کی بنیاد ہے، اگر تواضع پیدا ہو گئی تو اب ''متواضع'' آدمی بد اخلاق نہیں ہو سکتا، اس لئے بد اخلاقی جب بھی ہوگی اس میں تکبر شامل ہوگا، اور تواضع کا مطلب ہے ''اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنا'' اور دوسروں کو اپنے سے بڑا سمجھنا، اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا، اگر آدمی کے دل میں یہ بات آجائے کہ میں چھوٹا ہوں، باقی سب بڑے ہیں، اور بڑے ہونے سے مراد ''عمر'' اور ''علم'' میں بڑا ہونا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت میں اور تقویٰ میں نیکی میں سب مجھ سے بڑے ہیں، یا فی الحال بڑے ہیں، یا فی المآل ان کے بڑے ہونے کا احتمال ہے۔

تواضع پیدا کریں

لہٰذا دل میں اپنی کوئی بڑائی نہ ہو، بلکہ یہ سوچے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی عطا ہے، جب چاہیں واپس لے لیں، نہ میں اپنی ذات میں کوئی کمال رکھتا ہوں، نہ میرے پاس اپنی ذات میں کوئی خوبی ہے، اور دوسری مخلوق سب کو اللہ تعالیٰ نے بڑا نوازا ہوا ہے۔ یہ اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنا تواضع ہے، جب ایک شخص کے دل میں تواضع ہوگی، اور وہ یہ کہے گا کہ میں چھوٹا ہوں، یہ بڑا ہے، تو کیا ایسا شخص کسی بڑے کے ساتھ بداخلاقی کرے گا؟ نہیں کرے گا، اس لئے کہ بداخلاقی اس وقت ہوتی ہے جب دل میں اپنی بڑائی ہو، اور دوسروں کی تحقیر ہو کہ میں تو بڑا آدمی ہوں میرے حقوق لوگوں پر ہیں، اور لوگوں پر واجب ہے کہ وہ میرا فلاں حق ادا کریں، اگر وہ میرا حق ادا نہیں کر رہے ہیں تو وہ غلطی کر رہے ہیں، لہٰذا میں ان کے ساتھ اچھے انداز میں پیش نہیں آؤں گا، ساری بداخلاقی کی بنیاد اور جڑ یہ ہے۔

تواضع سے بلندی عطا ہوتی ہے

اگر تواضع پیدا ہو جائے تو پھر کوئی "بداخلاقی" سرزد نہیں ہوگی، اس لئے میں کہتا ہوں کہ خوش اخلاقی کی کلید اور بنیاد تواضع ہے، اور بداخلاقی کی بنیاد تکبر اور عجب ہے، اگر انسان اس تکبر اور عجب کا علاج کروالے، اور تواضع پیدا کرنے کی تدبیر اختیار کرلے، اور کسی اللہ والے کی صحبت کے نتیجے میں یہ تواضع پیدا ہو جائے تو پھر انشاء اللہ بداخلاقی قریب نہیں آئے گی، حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ

یعنی جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

اپنی حقیقت پر غور کریں

لہٰذا تواضع اختیار کرنے کے لئے انسان کو پہلے تو اپنی حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ میں کیا ہوں، قرآن کریم نے دو لفظوں میں انسان کی حقیقت بیان کردی، فرمایا کہ:

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ، مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ (عبس:۱۸،۱۹)

اگر انسان اس میں غور کرے تو سارا تکبر ختم ہو جائے گا، وہ یہ کہ کس چیز سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا؟ تمہاری اصل بنیاد کیا؟ وہ ایک نطفہ ہے، دوسری جگہ فرمایا کہ:

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (المرسلٰت:۲۰)

کیا ہم نے تمہیں ایک ذلیل اور گندے پانی سے پیدا نہیں کیا؟ یہ تمہاری اصل ہے، اگر انسان اپنی اس اصل میں غور کرے تو کبھی دماغ میں تکبر نہ آئے، اور پھر تو جب مرے گا تو اپنے پیارے اور اپنے محبت کرنے والے بھی تجھے گھر میں رکھنا گوارہ نہیں کریں گے، اس لئے کہ بدبو پیدا ہو جائے گی، اور سڑ جائے گا، لہٰذا تجھ کو لے جا کر قبر میں دفن کریں گے، وہ تیری ابتداء ہے، یہ تیری انتہاء ہے۔

''بیت الخلاء'' دکان معرفت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی اگر تمہارے دل میں اپنی بڑائی آئے تو اس وقت یہ تصور کرلیا کرو کہ بیت الخلاء میں میری کیا پوزیشن ہوتی ہے، میری اس حالت کو کوئی دیکھ لے تو مجھ سے گھن کرے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے جسم پر کھال کا پردہ ڈال رکھا ہے، ورنہ ذرا سی کھال کہیں سے الگ کرو تو یہ نظر آئے گا کہ اندر نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، کہیں خون ہے، کہیں پیپ ہے، کہیں پیشاب ہے، کہیں پاخانہ ہے، بس اس کھال کے پردے نے ان تمام نجاستوں کو چھپا رکھا ہے۔ یہ ہے تمہاری حقیقت، ویسے تو بڑا غرور ہے کہ میں ایسا ہوں، ویسا ہوں، یہ کردوں گا، وہ کردوں گا، ذرا سا دماغ کا اسکرو ڈھیلا ہو جائے تو سب ختم ہو جائے گا، پھر بھی کہتے ہو کہ میں بڑا ہوں، تو یہ شیطان تمہیں دھوکے میں ڈال رہا ہے، لہٰذا اپنی اصل پر غور کرو۔

اپنے آپ کو خادم سمجھو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحبؒ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے کہ یہ سارا فساد اس بنیاد پر ہے کہ تم نے اپنے آپ کو مخدوم بنایا ہوا ہے، ارے اپنے آپ کو خادم سمجھو کہ میں خادم ہوں، میں چھوٹوں کا بھی خادم ہوں، بڑوں کا بھی خادم ہوں، البتہ خدمت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، اگر استاد اپنے شاگرد کو پڑھا رہا ہے، یہ بھی خدمت کر رہا ہے، اس لئے استاذ کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو طالب علموں کا خادم سمجھے، کبھی تعلیم اور تلقین کے ذریعے خدمت

ہوتی ہے، لہٰذا یہ سمجھو کہ میں اپنی بیوی بچوں کا بھی خادم ہوں، اپنے بہن بھائیوں کا بھی خادم ہوں، اپنے عزیز واقارب کا بھی خادم ہوں، خادمیت اختیار کرو، پھر جب بھی کسی سے واسطہ پیش آئے تو یہ سمجھو کہ میں جس سے بات کررہا ہوں، میں اس کا خادم ہوں۔

منصب کے تقاضے پر عمل کرنا دوسری بات ہے

اگر کوئی بڑا ہو، صاحب اقتدار ہو، اس کے سامنے تو سبھی کو سر جھکانا پڑتا ہے، اسی کا حکم ماننا پڑتا ہے، اس کے سامنے سب تواضع کرنے لگتے ہیں، اور اس کے سامنے بولتی بند ہو جائے گی۔ لیکن وہ تواضع جو قابل تعریف اور قابل تحسین ہے، وہ یہ کہ اپنے برابر والوں کے ساتھ اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ تواضع سے پیش آئے، البتہ بعض اوقات کسی منصب کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے پر غصہ کرے، مثلاً ایک ملازم کام ٹھیک نہیں کررہا ہے، اب اس کی اصلاح کے لئے بعض اوقات غصہ بھی کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات سزا بھی دینی پڑجاتی ہے، بعض اوقات استاد شاگرد کو سزا دیتا ہے، بعض اوقات باپ بیٹے کو سزا دیتا ہے۔ یہ سزا دینا بھی خدمت ہے، لیکن اس وقت آدمی یہ سوچے کہ میں اپنے فریضہ منصبی کو ادا کرتے ہوئے یہ کام کررہا ہوں، اس وجہ سے یہ کام نہیں کررہا ہوں کہ میں بڑا ہوں، اور یہ مجھ سے چھوٹا ہے، اس لئے کہ کچھ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا مقام مجھ سے بہت اونچا ہو۔

خوبصورت مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک مثال دیا کرتے ہیں کہ اگر

بادشاہ نے اپنے کسی غلام کو چوکیدار بنا کر کھڑا کردے کہ تم دروازے پر کھڑے ہو جاؤ، اور صرف ان لوگوں اندر آنے دو جن کو اجازت ہو، اور دوسروں کو اندر مت آنے دینا، اب اگر کوئی شہزادہ بھی آئے گا تو چوکیدار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ شہزادے سے کہے کہ پہلے اپنی شناخت پیش کرو کہ تم کون ہو؟ پھر اندر آنے کی اجازت ہوگی، اگر وہ زبردستی اندر داخل ہونا چاہے گا تو چوکیدار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اس کو روک دے۔ اب دیکھئے کہ چوکیدار شہزادے کو روک رہا ہے، اور بظاہر اس پر حکم چلا رہا ہے، لیکن بتاؤ ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟ جس وقت وہ چوکیدار شہزادے کو روک رہا ہوتا ہے، اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں یہ بات نہیں ہوتی کہ میں شہزادے سے افضل ہوں، یا میں بڑا ہوں، اور یہ چھوٹا ہے، بلکہ اس کے دل میں اس وقت بھی یہ بات ہوتی ہے کہ بڑا تو شہزادہ ہی ہے، لیکن میں فرض منصبی کی ادائیگی کی خاطر اس کو روکنے پر مجبور ہوں۔

استاذ، شیخ اور باپ کا ڈانٹنا

اسی طرح اگر کوئی استاذ کسی شاگرد کو ڈانٹ رہا ہے، یا کوئی شیخ مرید کو ڈانٹ رہا ہے، یا کوئی باپ بیٹے کو ڈانٹ رہا ہے، یا اس کو کسی کام سے روک رہا ہے، تو اس کو یہ تصور کرنا چاہئے کہ میں اپنا فرض منصبی ادا کر رہا ہوں، حقیقت میں شاید یہ اللہ کا بندہ مجھ سے درجات کے اعتبار سے آگے بڑھا ہوا ہو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ میں آنے والوں کے لئے بڑے اصول مقرر فرمائے تھے، جب کوئی شخص ان اصولون کی خلاف ورزی

کرتا تو اس کی ڈانٹ ڈپٹ ہوتی۔ ان سب کے باوجود حضرت والا فرماتے ہیں کہ الحمد للہ میں جب بھی کسی کو ڈانٹتا ہوں تو دل میں یہ تصور کر لیتا ہوں کہ میں چوکیدار ہوں، اور یہ شہزادہ ہے، میرا چونکہ فرض منصبی ہے، اس لئے ڈانٹ رہا ہوں، ورنہ حقیقت میں یہی مجھ سے افضل ہے۔ دوسرا یہ کہ جس وقت ڈانٹ رہا ہوتا ہوں، اس وقت دل میں یہ بھی کہہ رہا ہوتا ہوں کہ یا اللہ! جس طرح میں اس سے مؤاخذہ کر رہا ہوں، میرا آخرت میں اس طرح مؤاخذہ نہ فرمایئے گا، بتایئے! جو شخص اپنے سے چھوٹے کے بارے میں دل میں یہ تصور بٹھا رہا ہو کہ یہ شہزادہ ہے، میں چوکیدار ہوں، اس کے دل میں تکبر کہاں سے آئے گا، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی ایسی تواضع پیدا فرما دے، آمین۔

تواضع بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے

یہ تواضع صحبت سے حاصل ہوتی ہے، متواضعین کی صحبت اختیار کرے گا، تواضع آئے گی، متکبروں کی صحبت اختیار کرے گا تو تکبر آئے گا۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صفت تواضع سے نوازا ہے، ان کی صحبت اختیار کرے، اور اپنی حقیقت پر غور کرتا رہے، اور یہ سمجھے کہ آخرت میں جو کچھ ملنے والا ہے وہ تنی ہوئی گردنوں کو نہیں ملے گا، بلکہ جھکی ہوئی گردنوں کو ملنے والا ہے، شکستگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو، فنائیت کا مظاہرہ کرنے والوں کو، اپنی بڑائی دل میں نہ لانے والوں کو ملنے والا ہے۔

جنت مسکینوں کا گھر ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ جنت اور جہنم کے درمیان

مناظرہ ہوا کہ کون افضل ہے؟ جہنم اس بات پر فخر کرنے لگی کہ میں متکبروں کا گھر ہوں، جابروں کا گھر ہوں، یعنی میرے اندر والے بڑے بڑے متکبرین ہیں، کوئی بادشاہ ہے، کوئی جابر ہے، کوئی وزیر ہے، کوئی فرعون ہے، میں ان کا گھر ہوں، اور جنت کہتی ہے کہ میں مسکینوں کا گھر ہوں، ''مسکین'' اس کو کہتے ہیں جس کی طبیعت میں عاجزی ہو، مسکنت ہو، اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ احْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ

اے اللہ! مسکینی کی حالت میں مجھے زندہ رکھیے، اور مسکینی کی حالت میں مجھے موت دیجیے، اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرمایئے۔ تو جنت یہ کہہ رہی ہے کہ مسکینوں کا گھر ہوں، بہر حال! مسکنت اور عاجزی اور فروتنی انسان کو جنت میں لے جاتی ہیں۔ تکبر اور گھمنڈ اور بڑائی انسان کو جہنم میں لے جانے والی ہیں، لہٰذا اپنے اندر تواضع پیدا کرنے کی فکر کرلو، اور اگر یہ پیدا ہوگئی تو پھر خوش خلقی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔

چوتھی صفت: لقمہ کا پاک ہونا

چوتھی صفت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ "عِفَّةٌ فِیْ طُعْمَةٍ" یعنی تمہارا لقمہ پاک اور حلال ہونا چاہیے، ''عفت'' کے لفظ سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ جو چیز صریح گناہ اور حرام ہے، اس سے بچنا ہی ہے، لیکن جہاں حرام کا شبہ ہو، اس شبہ والی چیز سے بھی بچنا ضروری ہے، اور مشتبہ چیز بھی

اپنے پیٹ میں نہ لے جاؤ، حتی الامکان اس کی کوشش کرو۔ بعض اوقات ایک چیز "فتوی" کی رو سے حلال تو ہوتی ہے، لیکن مشکوک ہوتی ہے، اور مشکوک ہونے کی صورت میں اگر وہ چیز حقیقت میں بھی حرام ہوئی تو چاہے اس کے کھانے کا گناہ آپ کو نہ ہو، اس لئے کہ فتوی کے رو سے وہ حلال تھی، لیکن چونکہ وہ چیز نفس الامر میں حرام تھی، اس لئے اس چیز کے برے اثرات اخلاق پر ضرور پڑتے ہیں۔

حرام کی ظلمت اور نحوست

ہم لوگوں کی تو حس خراب ہوگئی ہے، اس لئے حرام کھالیں، یا مشکوک کھالیں، کچھ پتہ نہیں چلتا، سب چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن جن کو اللہ تعالی حس عطا فرماتے ہیں، ان کو پتہ چلتا ہے کہ حلال اور حرام میں کیا فرق ہے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک دعوت میں چلا گیا، اور پہلے سے پتہ نہیں تھا کہ اس شخص کی آمدنی حرام ہے، ناواقفیت میں چلا گیا کہ وہ مسلمان ہے آمدنی حلال ہوگی، اس لئے کچھ کھا لیا، اور جب پتہ چلا تو فوراً کھانا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا، لیکن وہ ایک دو لقمے جو نادانی میں کھالئے اس کی ظلمت قلب میں ایک مہینے تک محسوس ہوتی رہی، وہ ظلمت یہ تھی کہ بار بار دل میں گناہوں کے خیالات آتے رہے کہ یہ گناہ کرلوں، فلاں گناہ کرلوں، حالانکہ فتوی کی رو سے وہ حلال تھا، اس لئے کہ پتہ نہیں تھا۔

حلال کھانے کی نورانیت

ذرا غور کریں کہ ہم لوگ کس شمار و قطار میں ہیں، ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلتا

کہ کس میں نور ہے، اور کس میں ظلمت ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ دیوبند میں ایک گھسیارے تھے، جو گھاس کاٹ کر اس کو فروخت کرکے زندگی بسر کرتے تھے، اس میں سے دو پیسے بچا کر دارالعلوم دیوبند کے بڑے بڑے اساتذہ کی دعوت کیا کرتے تھے، اور اس دعوت میں خشکہ اور دال پکاتے تھے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے مہینوں سے اس اللہ کے بندے کی دعوت کا انتظار رہتا تھا کہ کب یہ دعوت کریں گے، اس لئے کہ جس دن ان کی دعوت کھالیتا ہوں، مہینوں تک اس کا نور اپنے قلب میں محسوس کرتا ہوں۔

بہرحال! اگر کھانے میں پاکدامنی حاصل کرنی ہے، اس کے لئے مشکوک غذاؤں سے بھی حتی الامکان پرہیز کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپ سب کو بھی ان چاروں صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین

بڑوں سے آگے مت بڑھو

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۶

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

بڑوں سے آگے مت بڑھو

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا،مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ،وَاَشْھَدُاَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ،وَاَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَنَبِیَّنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً۔

اَمَّا بَعْدُ فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ○ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَاتُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوْا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَاتَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَاتَشْعُرُوْنَ ○ (سورۃ الحجرات: ۱،۲)

آمنت باللّٰہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم و صدق رسولہ

النبی الکریم ونحن علی ذٰلک من الشاھدین و الشاکرین والحمد للّٰہ ربّ العلمین.

سورۃ الحجرات دو حصوں پر مشتمل ہے

بزرگان محترم وبرادران عزیز! میں نے آپ کے سامنے سورۃ الحجرات کی ابتدائی دو آیات تلاوت کیں، یہ سورۃ دو حصوں پر منقسم ہے، پہلا حصہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم اور آپ کے ساتھ معاملات کرنے کے آداب پر مشتمل ہے، یعنی مسلمانوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس طرح معاملہ کرنا چاہیے، دوسرا حصہ مسلمانوں کے باہمی معاشرت اور تعلقات کے احکام اور آداب پر مشتمل ہے۔

قبیلہ بنوتمیم کے وفد کی آمد

اس سورۃ کا پہلا حصہ جس واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوا، وہ واقعہ یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبیلہ بنوتمیم کا ایک وفد مسلمان ہوکر آیا، اس زمانے میں مختلف قبائل کے وفود اسی غرض سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آرہے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلامی تعلیمات حاصل کر رہے تھے، جب کوئی وفد واپس جانے کا ارادہ کرتا تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں سے ایک کو ان کا امیر مقرر فرما دیتے، تاکہ آئندہ وہ امیر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے رابطہ رکھے، اور آپ کے احکام اپنے قبیلے کے لوگوں تک پہنچانے میں معاون ثابت ہو۔

حضرات شیخین کا اپنے طور پر امیر مقرر کرنا

جب قبیلہ بنو تمیم کا وفد آیا اور اسلامی تعلیمات حاصل کر کے جانے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کے اندر بھی ایک کو امیر مقرر کرنا تھا، لیکن ابھی تک آپ نے کسی کو متعین فرما کر اعلان نہیں کیا تھا، صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ بھی تشریف فرما تھے، قبل اس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود قبیلہ بنو تمیم کے لئے کسی امیر کا تعین فرمائیں، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے آپس میں یہ مشورہ شروع کر دیا کہ بنو تمیم میں سے کس کو امیر بنانا چاہئے؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قعقاع ابن معبد کو امیر بنانے کی تجویز پیش کی، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اقرع بن حابس کو امیر بنانے کی تجویز پیش کی، اور ہر ایک نے اپنی تجویز کے حق میں دلائل دینے شروع کر دیے، اس گفتگو کے دوران ان دونوں حضرات کی آوازیں بلند ہو گئیں، جبکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں موجود تھے، اس موقع پر سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔

دو غلطیاں سرزد ہوئیں

ان آیات نے حضرات شیخین کو متنبہ فرمایا کہ اس خاص واقعہ میں دو باتیں غلط ہوئیں، ایک یہ کہ جب ابھی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ موضوع چھیڑا نہیں تھا کہ کس کو امیر بنایا جائے؟ نہ آپ نے خود کوئی اعلان کیا تھا، نہ آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا تھا کہ بتاؤ کس کو امیر بنایا جائے؟ تو حضور کے اعلان سے پہلے اور مشورہ طلب کرنے سے پہلے یہ گفتگو جو شروع کی گئی یہ مناسب

نہیں تھی، بلکہ غلط اور قابل اعتراض تھی۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ گفتگو کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان دونوں حضرات کی آوازیں بلند ہو گئیں، حالانکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں تشریف فرما ہوں تو کسی شخص کا بلند آواز سے بولنا آپ کی تعظیم اور تکریم کے مناسب نہیں تھا، اس لئے آئندہ اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

پہلی غلطی پر تنبیہ

بہر حال! سورۃ الحجرات میں سب سے پہلے ان دو غلطیوں پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو،

یہ اس آیت کا لفظی ترجمہ ہے، اس آیت کا پس منظر وہی ہے کہ ابھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو تمیم میں سے کسی کو امیر بنانے کا مسئلہ چھیڑا نہیں تھا، نہ خود آپ نے اعلان کیا تھا اور نہ ہی صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا تھا، اس سے پہلے اپنی طرف سے اس کی گفتگو چھیڑ دینا یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کے مرادف تھا، اس پر تنبیہ فرمائی۔

یہ قرآن قیامت تک رہنمائی کرتا رہے گا

لیکن قرآن کریم کا یہ عجیب وغریب معجزانہ اسلوب ہے کہ بسا اوقات ایک آیت کسی خاص واقعہ پر نازل ہوتی ہے کہ کوئی واقعہ پیش آیا، اور اس میں مسلمانوں کو تعلیم دینی مقصود تھی، کوئی ہدایت دینی مقصود تھی، اس پر آیت نازل فرما

دی، لیکن یہ قرآن کریم قیامت تک کے انسانوں کی رہنمائی کے لئے آیا ہے، اس لئے الفاظ ایسے لاتے ہیں کہ جس سے وہ رہنمائی اس واقعہ کی حد تک محدود نہ رہے، بلکہ قیام قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے ایک ابدی رہنمائی ثابت ہو۔ چنانچہ اس میں یہ نہیں فرمایا کہ بنو تمیم کے وفد میں سے کسی ایک کو امیر بنانے کے سلسلے میں تم لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے پہلے کیوں بات شروع کردی، یہ نہیں فرمایا، بلکہ ایک عام حکم دیدیا کہ "اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو" اس ایک جملے سے بہت سارے احکام نکل رہے ہیں، کیا کیا احکام ہیں؟ آج کی محفل میں اسی کو بیان کرنا مقصود ہے۔

حضور کی اجازت کے بغیر گفتگو جائز نہیں

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو" اس حکم سے ایک براہ راست مفہوم تو یہ نکل رہا ہے کہ جو موضوع حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی چھیڑا نہیں، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور اجازت کے بغیر گفتگو کرنا جائز نہیں، یہ تو ایک واقعہ تھا، لیکن ہوسکتا ہے کہ آئندہ بھی اس طرح کی صورت پیش آجائے، اس لئے یہ حکم دیدیا کہ جو معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی چھیڑا نہیں، اس پر اپنی طرف سے رائے زنی شروع نہ کرو۔

عالم سے پہلے گفتگو کرنا جائز نہیں

اسی آیت کے تحت علماء کرام نے فرمایا کہ چونکہ یہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے ابدی ہدایت ہے، لہٰذا اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے درمیان

تشریف فرما نہیں رہے، لیکن ان کے وارثین انشاء اللہ قیامت تک رہیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ:

العلماء ورثة الانبياء

یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں، اس لئے مفسرین نے فرمایا کہ یہی حکم ان مقتدا علماء کا بھی ہے، جن کی بات لوگ سنتے ہوں، اور مانتے ہوں، جن کو اللہ تعالیٰ نے دین اور شریعت کا علم عطا فرمایا ہو، ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر ان کی مجلس میں کوئی سوال کیا گیا ہو تو ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر کسی شخص کا ان عالم کی اجازت کے بغیر اپنی طرف سے بول پڑنا اس عالم کی تعظیم وتکریم کے بھی خلاف ہے، اور آداب مجلس کے بھی خلاف ہے، اور بے ادبی ہے، یا ابھی تک کسی موضوع پر گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دی، اس سے پہلے لوگوں نے خود سے آپس میں اس موضوع پر گفتگو شروع کردی، یہ بھی آداب مجلس کے خلاف ہے، اور بے ادبی ہے، البتہ اگر خود صاحب مجلس مشورہ طلب کرے کہ فلاں مسئلہ ہے، آپ حضرات اپنے رائے دیں، تو اس صورت میں آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ یا اگر کسی موضوع پر کوئی بات چھیڑنی ہے تو پہلے صاحب مجلس سے اجازت لے کہ کیا اس مسئلے پر گفتگو کرلی جائے؟ اگر وہ اجازت دیدے تو پھر بے شک اس پر گفتگو کریں، لیکن بغیر اجازت کے گفتگو شروع نہ کریں، کیونکہ اس کے نتیجے میں صاحب مجلس سے آگے بڑھنا لازم آئے گا، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے، اس آیت کا ایک براہ راست مفہوم تو یہ تھا۔

راستے میں نبی یا علماء سے آگے بڑھنا

اس آیت سے دوسرا حکم یہ نکل رہا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کہیں تشریف لے جا رہے ہوں تو راستے میں چلنے کے دوران ان سے آگے بڑھنا بے ادبی ہے، آپ کی عظمت کا اور آپ کی تعظیم و تکریم کا تقاضا یہ ہے کہ جب آپ کے ساتھ چلیں تو ذرا سا پیچھے ہو کر چلیں، آگے آگے نہ چلیں، یہ بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے، اس حکم کے بارے میں بھی مفسرین نے فرمایا کہ چونکہ یہ حکم بھی قیام قیامت تک کے لئے ہے، لہٰذا انبیاء کرام کے وارثین کے بارے میں بھی یہ حکم ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنے کسی بڑے کے ساتھ، مثلاً کسی عالم کے ساتھ، شیخ کے ساتھ، استاد کے ساتھ چل رہا ہے تو اس کو ان سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یا تو ساتھ بساتھ چلے، یا ذرا سا پیچھے رہے، آگے بڑھنا بے ادبی ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے، یہ دوسرا حکم تھا۔

سنت کی اتباع میں کامیابی ہے

تیسرا حکم جو اس آیت سے نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ تمہاری دنیا و آخرت کی صلاح اور فلاح اور کامیابی کا دارومدار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں ہے، لہٰذا جو آپ کی سنت ہو، اس پر عمل کرو، آپ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو، یعنی آپ نے جس طرح زندگی گزاری ہے، جس میں آپ نے تمام اہل حقوق کو ان کا حق دیا، اپنے نفس کا حق ادا کیا، اپنے گھر والوں کا حق ادا کیا، اپنے ملنے جلنے والوں کا حق ادا کیا، اپنے دوست و احباب کا حق ادا کیا، اس طرح تم بھی حقوق ادا کرتے ہوئے زندگی گزارو، ایسا نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کا شائبہ پیدا ہو جائے، بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرو۔

تین صحابہ کے عبادت کے ارادے

ایک حدیث میں آتا ہے کہ چند صحابہ کرام تشریف فرما تھے، انہوں نے

آپس میں یہ گفتگو شروع کی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا اونچا مقام عطا فرمایا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتا، اور آپ گناہوں سے معصوم ہیں، آپ سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی، اور اگر کوئی بھول چوک ہو تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا ہے کہ:

لَقَدْ غَفَرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (سورۃ الفتح:۲)

اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام اگلی پچھلی بھول چوک بھی معاف کر دی ہیں، لہٰذا آپ کو زیادہ عبادت کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے آپ تو سو بھی جاتے ہیں، اور دن میں افطار بھی کر لیتے ہیں، لیکن ہمیں تو جنت کی بشارت نہیں ملی ہے، جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی ہوئی ہے، اس وجہ سے ہمیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے، اس گفتگو کے بعد ان میں سے ایک صحابی نے یہ کہا کہ میں آج سے رات کو نہیں سوؤں گا، بلکہ ساری رات تہجد پڑھا کروں گا۔ دوسرے صحابی نے کہا کہ اب میں ساری زندگی روزے رکھوں گا، کوئی دن بھی روزے کے بغیر نہیں گزاروں گا۔ تیسرے صحابی نے کہا کہ زندگی بھر شادی نہیں کروں گا، تاکہ میں بیوی بچوں میں مشغول ہونے کے بجائے عبادت میں مشغول رہوں، اور عبادت سے غافل نہ ہوں۔

کوئی شخص نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا

اب آپ دیکھئے کہ ان تین صحابہ نے جو ارادے کئے وہ نیکی کے ارادے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ارادہ کیا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا کہ ان صحابہ کرام نے یہ ارادے کئے ہیں، تو آپ نے ان تینوں کا بلوایا، اور ان سے فرمایا کہ:

أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَ أَتْقَاكُمْ أَنَا

یعنی اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت مجھے حاصل ہے، اتنی معرفت کائنات میں کسی کو حاصل نہیں، اور اللہ کا خوف اور تقویٰ جتنا اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے، کائنات میں کسی کو اتنا تقویٰ حاصل نہیں، اس کے باوجود میں سوتا بھی ہوں، اور رات کو اٹھ کر نماز بھی پڑھتا ہوں، کسی دن روزہ رکھتا ہوں، کسی دن روزہ نہیں رکھتا، اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ یادرکھو! اسی سنت میں تمہارے لئے نجات ہے۔

فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ

''اگر کوئی شخص میری سنت سے اعراض کرے گا، وہ مجھ سے نہیں ہوگا''

اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتا دیا کہ دنیا و آخرت کی ساری صلاح اور فلاح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی اتباع میں ہے، کوئی شخص یہ چاہے کہ میں نبی سے آگے بڑھ جاؤں، یادرکھیے! کوئی شخص بھی نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

حقوق کی ادائیگی اتباع سنت ہے

ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عبادت فرض کی ہے، اور عبادت کی ترغیب دی ہے، اسی طرح تم پر کچھ حقوق بھی عائد کیے ہیں، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے ملنے جلنے والوں کا بھی تم پر حق ہے، جب تم ان تمام حقوق کی ادائیگی ایک ساتھ کرو گے تو اتباع سنت ہوگا۔ لیکن اگر راہبوں کی طرح جنگل میں جا کر بیٹھ گئے اور یہ کہا کہ میں دنیا

کو چھوڑ کر یہاں پر ''اللہ اللہ'' کروں گا، یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع نہیں ہے۔ بہر حال! اس آیت کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو، بلکہ جس کام کو جس حد میں کرنے کا حکم دیا ہے، اس کام کو اسی حد میں رکھو، اس سے آگے نہ بڑھو۔

دین ''اتباع'' کا نام ہے

یاد رکھیے! اپنی خواہش اور اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں، بلکہ دین نام ہے اتباع کا، اللہ کے حکم کی اتباع، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کا نام ''دین'' ہے، لہٰذا جس وقت اللہ اور اللہ کے رسول کا جو حکم آجائے اور آپ کی اتباع کا جو تقاضا ہو، وہی خیر ہے اور وہی اطاعت ہے، اور اسی میں تمہاری دنیا و آخرت کی کامیابی ہے، اپنی طرف سے کوئی راستہ مقرر کر کے چل پڑنا کہ میں تو یہ کروں گا، یہ بات صحیح نہیں۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو، اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ جو کام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا، مجھے تو وہ کام کرتے ہوئے شرم آتی ہے، تو گویا وہ شخص یہ دعوا کر رہا ہے کہ میرا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اونچا مقام ہے، میں بڑا آدمی ہوں، اس لئے یہ کام میں نہیں کرتا۔ العیاذ باللہ۔ یہ بھی درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے میں داخل ہے، اس کی متعدد مثالیں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے واقعات میں ملتی ہیں۔

بارش میں گھر میں نماز پڑھنے کی رخصت

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ جب بارش ہو رہی

ہو، اور کیچڑ اتنا زیادہ ہو جائے کہ لوگوں کو اس میں چلنے میں بہت زیادہ دقت ہو، اور پھسلنے کا اندیشہ ہو، پاؤں لت پت ہو جائے، اور کپڑے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو تو شریعت نے ایسے موقع پر رخصت دی ہے کہ مسجد کے بجائے آدمی گھر میں نماز پڑھ لے۔ اب آج کل ہم لوگ شہر میں رہتے ہیں، جہاں گلیاں اور سڑکیں پکی بنی ہوئی ہیں، اس لئے یہاں بارش ہونے سے یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی کہ اتنا کیچڑ ہو جائے کہ آدمی کے لئے چلنا دشوار ہو جائے۔ لیکن جہاں کچے مکانات اور کچی گلیاں ہوں، وہاں آج بھی یہ حکم موجود ہے کہ ایسی صورت میں جماعت معاف ہو جاتی ہے، اور آدمی کے لئے گھر میں نماز پڑھنا جائز ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے ہیں، وہ ایک مرتبہ مسجد میں بیٹھے تھے، اذان کا وقت ہو گیا، اور ساتھ ہی تیز موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، مؤذن نے اذان دی، اس کے بعد آپ نے مؤذن سے کہا کہ یہ اعلان کر دو کہ "الصلوة في الرحال" یعنی سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھیں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی الفاظ ثابت ہیں کہ ایسے موقع پر یہ اعلان کر دینا چاہئے۔ اب لوگوں کے لئے یہ بات بڑی اجنبی تھی، اس لئے کہ ساری زندگی تو دیکھتے آ رہے تھے کہ مسجد سے تو یہ اعلان ہوتا ہے کہ "حي على الصلوة، حي على الفلاح" نماز کے لئے آؤ، کامیابی کے لئے آؤ، لیکن یہاں الٹا اعلان ہو رہا ہے کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھو، چنانچہ لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اعتراض کیا کہ حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ لوگوں کو مسجد میں آنے سے منع کر رہے

ہیں؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: نعم افعل ذلك من هو خير منی و منك، ہاں میں ایسا ہی اعلان کراؤں گا، کیونکہ یہ اعلان اس ذات نے بھی کرایا ہے، جو مجھ سے بھی بہتر ہے، اور تم سے بھی بہتر ہے، یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے تو اعلان کرنا برا لگتا ہے، اور مجھے ایسا اعلان کرتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہو، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا، اور یہ رخصت دی، اور تم کہتے ہو کہ میں یہ رخصت نہیں دیتا، مجھے یہ اعلان کرنا برا لگتا ہے۔ بہرحال! دین کے کسی بھی معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی تعلیم سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے سے ممانعت بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

اللہ سے ڈرو

آگے فرمایا'' وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ '' اللہ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ سب کچھ سن رہے ہیں، اور سب کچھ جانتے ہیں۔ بہرحال! اللہ اور اللہ کے رسول سے آگے بڑھنے کی تین مثالیں تو میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیں، کچھ اور مثالیں ابھی بیان کرنا باقی ہیں، وقت ختم ہو رہا ہے، اللہ نے زندگی عطا فرمائی تو آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰه رب العٰلمین

بدعات حرام کیوں؟

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بدعات حرام کیوں؟

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَنَبِیَّنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدًاعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم○بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ○ یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ. (سورۃ الحجرات: ۱)

آمنت باللّٰہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم ونحن علی ذٰلک من الشاھدین و الشاکرین والحمد للّٰہ ربّ العٰلمین.

تمہید

بزرگان محترم و برادران عزیز! سورۂ حجرات کی ابتدائی آیات کا بیان گذشتہ جمعہ کو شروع کیا تھا، پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ: اے ایمان والو! اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔ اس آیت سے

کئی احکام نکلتے ہیں، جن میں سے تین احکام کا بیان گذشتہ جمعہ کو ہو چکا ہے۔

دین میں اضافہ کرنا

اس آیت سے چوتھا حکم یہ نکل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے، وہ کامل اور مکمل دن ہے، جس کی صراحت قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمائی کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدہ: ۳)

یعنی آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر کامل کر دیا، لہٰذا کوئی بھی ایسا عمل جو حقیقت میں دین نہیں ہے، اور جو عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلقین نہیں فرمائی تھی، اور قرآن کریم میں اس کا حکم نہیں آیا، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے اس کو اختیار نہیں کیا تھا، ایسے نئے عمل کو ہم دین کا حصہ سمجھ کر شروع کر دیں، اور اس عمل کو واجب یا سنت قرار دیں، یا اس عمل کے ترک کرنے والے پر ملامت شروع کر دیں، یہ طرز عمل بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کے مرادف ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے۔

ان چیزوں کا استعمال جائز ہے

دیکھئے! بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نہیں تھیں، نہ ان کا رواج تھا، لیکن زمانے کے حالات کی تبدیلی کی وجہ سے وہ چیزیں وجود میں آئیں، اور لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ مثلاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بجلی نہیں تھی، آج ہمارا بجلی کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں پنکھے نہیں تھے، آج ہمارا پنکھے کے بغیر گزارا

نہیں۔ اس زمانے میں گھوڑے اور اونٹوں پر سفر ہوتا تھا، آج موٹروں کی، بسوں کی، ریلوں اور ہوائی جہازوں کی بھرمار ہے، ان کے بغیر گزارا نہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ کوئی ان کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، مثلاً کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ پنکھا چلانا سنت ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ بجلی جلانا واجب ہے، اور شرعی اعتبار سے ضروری ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ ریل میں سفر کرنا سنت یا مستحب ہے، یا واجب ہے، لہٰذا کوئی شخص ان چیزوں کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، بلکہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے نئے نئے طریقے وجود میں آتے رہتے ہیں، اس لئے شریعت نے بھی ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی، ان سب چیزوں کو استعمال کرنا شرعاً جائز ہے۔

ہر بدعت گمراہی ہے

لیکن کوئی نیا کام انسان اس خیال سے شروع کرے کہ یہ دین کا حصہ ہے، یا یہ سوچے کہ یہ کام واجب ہے، یا سنت ہے، یا فرض ہے، یا مستحب ہے، یا یہ ثواب کا کام ہے، حالانکہ وہ کام نہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، نہ آپ نے اس کا حکم دیا، اور نہ صحابہ کرام نے وہ کام کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں استغفر اللہ۔ شریعت میں اسی کا نام "بدعت" ہے، "بدعت" کے لغوی معنی ہیں "نئی چیز"، لہٰذا لغت کے اعتبار سے تو یہ پنکھا بھی بدعت ہے، یہ بجلی بھی بدعت ہے، یہ ٹائلز اور ماربل بھی بدعت ہے، یہ کاریں یہ بسیں اور یہ ہوائی جہاز بھی بدعت ہے۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں "بدعت" اس نئے کام کو کہا جاتا ہے جس کا حکم نہ قرآن کریم نے دیا ہو، اور نہ ہی سنت سے اس کا ثبوت ہو، اور نہ صحابہ کرام نے

اس پر عمل کیا ہو، اور نہ ہی اس کی تلقین کی ہو، ایسے کام کو شریعت کی اصطلاح میں "بدعت" کہا جاتا ہے، بدعت کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ

یعنی ہر وہ نیا کام جو دین میں پہلے داخل نہیں تھا، اور نہ دین کا حصہ تھا، آج اس کو دین میں داخل کر دیا گیا، وہ "بدعت" ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔

بدعت گمراہی کیوں ہے؟

"بدعت" گمراہی کیوں ہے؟ اس لئے کہ بدعت میں اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ جو شخص بدعت کو اختیار کرنے والا ہے وہ درحقیقت یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے جو دین ہمیں دیا تھا وہ ادھورا اور ناقص تھا، آج میں نے اس میں اس عمل کا اضافہ کر کے اس کو مکمل کر دیا۔ گویا کہ آدمی عملی طور پر بدعت کے ذریعہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے آگے نکل جاؤں۔ جو چیز دین میں داخل کی جاتی ہے بظاہر دیکھنے میں وہ ثواب کا کام معلوم ہوتی ہے، عبادت لگتی ہے، لیکن چونکہ وہ عبادت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہوتی، اس لئے وہ عبادت بدعت ہے، اور بدعت گمراہی ہے۔ جتنی بدعات ہوتی ہیں ان میں براہ راست گناہ کا کام نہیں ہوتا، لیکن چونکہ اس عمل کو کسی اتھارٹی کے بغیر دین کے اندر شامل کر دیا گیا، اس عمل کے بارے میں ہمارے پاس قرآن کی اور سنت کی کوئی اتھارٹی نہیں تھی، بلکہ ہم نے اپنی طرف سے اس کو دین میں داخل کر دیا، اس لئے

وہ بدعت بن گئی۔

شب برأت میں سو رکعت نفل پڑھنا

مثلاً بعض لوگوں نے ۱۵/شعبان کی رات یعنی شب برأت میں لوگوں کے لئے نماز کا ایک خاص طریقہ مقرر کر دیا، وہ یہ کہ ایک ہی تحریمہ اور ایک سلام کے ساتھ سو رکعتیں نفل پڑھیں، اور ہر رکعت میں خاص خاص سورتوں کا پڑھنا مقرر کر دیا کہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ، دوسری میں فلاں سورۃ اور تیسری میں فلاں سورۃ وغیرہ۔ ایک زمانے میں یہ طریقہ اتنی شہرت اختیار کر گیا تھا کہ جگہ جگہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ سو رکعتیں پڑھی جا رہی تھیں، اگر کوئی شخص یہ سو رکعتیں نہیں پڑھتا تو اس کو برا کہا جاتا کہ اس نے شب برأت نہیں منائی۔ اب آپ دیکھیں کہ جو شخص شب برأت میں سو رکعتیں پڑھ رہا ہے، کیا وہ کوئی چوری کر رہا ہے، یا ڈاکے ڈال رہا ہے، یا وہ بدکاری کر رہا ہے، نہیں، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر اللہ کا ذکر کر رہا ہے، رکوع، سجدے کر رہا ہے، لیکن تمام علماء امت نے فرمایا کہ یہ عمل گناہ ہے، اور بدعت ہے، ناجائز ہے، اس لئے کہ اس نے اپنی طرف سے دین میں ایک چیز کا اضافہ کر دیا، جو دین کا حصہ نہیں تھا، لہٰذا یہ عمل بدعت ہو گیا، اور گناہ ہو گیا۔

ہم کوئی گناہ کا کام نہیں کر رہے

اگر ان سے پوچھا جائے کہ بھائی تم یہ جو عمل کر رہے ہو، اس کا نہ تو قرآن کریم میں کہیں ذکر ہے، نہ حدیث شریف میں اس کا کہیں ذکر ہے، یہ عمل تو بدعت ہے، یہ کیسے جائز ہو گیا؟ وہ لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم کوئی گناہ کر رہے ہیں، یا ہم چوری ڈاکہ ڈال رہے ہیں؟ بلکہ ہم تو قرآن کریم پڑھ رہے

ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدے کر رہے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہے ہیں، کوئی گناہ کا کام تو نہیں کر رہے ہیں۔

مغرب کی تین کے بجائے چار رکعت پڑھیں تو کیا نقصان

خوب سمجھ لیجئے کہ کوئی بھی عبادت اس وقت تک عبادت کہلانے کی مستحق نہیں جب تک اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی سند موجود نہ ہو، ورنہ وہ عبادت بدعت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں، اور ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد متعین فرمائی ہے کہ فجر میں دو رکعت فرض پڑھو، اور ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار رکعت فرض پڑھو، اور مغرب میں تین رکعت پڑھو، اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ یہ تین رکعتوں کی تعداد تو اچھی معلوم نہیں ہوتی، لہٰذا مغرب میں تین کے بجائے چار رکعت پڑھوں گا، اب اگر کوئی شخص مغرب کی تین رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھ لے تو کیا اس نے کوئی ڈاکہ ڈالا، کوئی چوری کی، کیا اس نے بدکاری کی؟ کیا اس نے شراب پی لی؟ نہیں، بلکہ اس نے تو ایک رکعت زیادہ پڑھ لی، اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، ایک رکوع زیادہ کیا، دو سجدے زیادہ کئے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح زیادہ کی۔ لیکن اس شخص نے یہ جو چوتھی رکعت اپنی طرف سے زیادہ پڑھ لی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ثواب زیادہ ملنے کے بجائے یہ ایک رکعت پہلی تین رکعتوں کو بھی لے ڈوبے گی، اور اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مغرب کی نماز کا جو طریقہ بتایا گیا تھا، اس طریقہ سے ہٹ کر اس نے اپنے طریقے پر نماز پڑھ لی، اور اس طریقہ کو دین کا حصہ سمجھ کر اس کو دین میں داخل کر لیا، اسی کا نام "بدعت" ہے۔

افطار کرنے میں جلدی کیوں؟

یاد رکھیے! دین نام ہے اس بات کا کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کام کا جس درجہ میں حکم دیا ہے، بس اسی درجہ میں اس کی اتباع کی جائے، اور اس پر عمل کیا جائے، اگر اس سے آگے یا پیچھے ہٹو گے تو وہ دین نہیں۔ اور اگر دین سمجھ کر اس کو اختیار کر رہے ہو تو وہ ''بدعت'' ہے۔ جیسے رمضان میں ہم روزہ رکھتے ہیں، روزے کے لئے صبح سحری کھاتے ہیں، سارا دن بھوکے رہتے ہیں، اور جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو افطار کر لیتے ہیں۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب آفتاب غروب ہو جائے تو افطار کرنے میں جلدی کرو، افطار کرنے میں دیر مت کرو، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افطار کرنے میں جلدی کیوں کریں؟ جب دن بھر اللہ کے لئے بھوکے پیاسے رہے تو اب اگر ایک گھنٹہ مزید بھوکے پیاسے رہ جائیں گے تو اس میں کیا قیامت آجائے گی؟ اور کیا خرابی پیدا ہو جائے گی؟ بظاہر تو اس میں کوئی گناہ کی بات نظر نہیں آتی۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آفتاب غروب ہوتے ہی جلد از جلد افطار کرو، اور کچھ کھا پی لو، اس لئے کہ اللہ کا حکم یہ تھا کہ تمہیں آفتاب کے غروب ہونے تک بھوکا پیاسا رہنا ہے، اب آفتاب غروب ہونے کے بعد روزہ نہیں ہے، اب اگر تم اس روزے کو آگے بڑھاؤ گے اور یہ سوچو گے کہ ایک گھنٹے کے بعد افطار کروں گا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روزے کی جو میعاد اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی تھی، اس میں تم نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا، یہ اتباع نہیں ہوئی، اتباع تو یہ ہے کہ جب وہ کہیں کہ مت کھاؤ، تو نہ کھانا عبادت ہے، اور جب وہ کہیں کہ کھاؤ تو اب کھانا واجب ہے، اگر نہیں کھاؤ گے تو گنہگار ہو گے۔

عید کے دن روزہ رکھنے پر گناہ کیوں؟

یا مثلاً روزہ رکھتے ہوئے رمضان کا پورا مہینہ گزر گیا، اور روزے رکھنے کی اتنی فضیلت ہے کہ جو شخص رمضان کے روزے رکھے، اللہ تعالیٰ اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں، اور روزے کی یہ فضیلت ہے کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کے منہ سے جو بو آرہی ہے، اللہ تعالیٰ کو وہ بو مشک وعنبر سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ لیکن جب عید کا دن آگیا تو اب اگر کسی نے روزہ رکھ لیا تو وہی روزہ جو رمضان میں بڑے اجر وثواب کا موجب تھا، اب الٹا عذاب کا موجب بن جائے گا، حالانکہ اگر کوئی شخص عید کے دن روزہ رکھ لے تو بظاہر تو کوئی گناہ نظر نہیں آتا، کیونکہ وہ روزہ رکھ کر ایک عبادت ہی انجام دے رہا ہے۔ لیکن چونکہ وہ شخص اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف عبادت کر رہا ہے، لہٰذا وہ عبادت نہیں، بلکہ وہ گناہ ہے، اس پر عذاب ہوگا۔ تو دین نام ہے "اتباع" کا، اب اگر کوئی شخص دین میں کوئی نیا طریقہ جاری کر کے اس کا نام "عبادت" رکھ دے، اور اس کو دین کا حصہ قرار دیدے، اور اس کو "سنت" کہے، اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے، اور اگر کوئی شخص اس پر عمل نہ کرے تو اس پر لعنت وملامت کرے، اور یہ کہے کہ یہ شخص بے دین ہے، یہ طرز عمل اس کو "بدعت" بنا دیتا ہے، اور بدعت ہونے کے نتیجے میں وہ ثواب کا کام ہونے کے بجائے الٹا گناہ کا کام بن جاتا ہے، اس لئے کہ وہ شخص دین میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے گویا کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، جبکہ قرآن کریم کا حکم یہ ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوْا

اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔ جس حد پر انہوں نے رہنے کے لئے کہا ہے، اسی حد پر رہو، اس سے آگے نہ بڑھو، اگر آگے بڑھو گے تو تم بدعت کے مرتکب ہو گے۔

سفر میں چار رکعت پڑھنا گناہ کیوں؟

یا مثلاً سفر کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے رکعتوں کی تعداد کم فرما دی اور یہ حکم دیا کہ شرعی سفر کے دوران چار فرضوں کے بجائے دو فرض پڑھو۔ اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے بیشک میرے لئے رکعتوں کی تعداد میں کمی کر دی ہے، لیکن میرا دل نہیں مان رہا ہے، میں تو پوری چار رکعت ہی پڑھوں گا۔ ایسا کرنا اس کے لئے جائز نہیں، حالانکہ اگر وہ شخص دو رکعتیں زائد پڑھ رہا ہے تو وہ کوئی گناہ نہیں کر رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اضافہ کر رہا ہے، لیکن چونکہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف عبادت کر رہا ہے، اس وجہ سے ناجائز اور گناہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر پکڑ ہو جائے گی کہ ہم نے تم سے دو رکعتیں پڑھنے کو کہا تھا، تم نے چار کیوں پڑھیں؟ معلوم ہوا کہ دین نام ہے "اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع" کا، وہ جب کم پڑھنے کا حکم دیں تو کم پڑھو، وہ جب زیادہ کا حکم دیں تو زیادہ پڑھو، لیکن اپنی طرف سے اس کے اندر کمی زیادتی تمہارے لئے جائز نہیں۔

یہ نکتہ اس لئے سمجھنا ضروری ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں بے شمار طریقے دین کے نام پر جاری کر دیے گئے ہیں، اور اس طرح جاری کر دیے گئے ہیں کہ گویا کہ وہ دین کا لازمی حصہ ہیں، اگر کوئی شخص وہ کام نہ کرے تو وہ ملامتی

ہے، اس پر لعنت و ملامت کی جاتی ہے، اس پر طعن و تشنیع کی جاتی ہے، اس کو برا سمجھا جاتا ہے، اور اس کو ایک طرح سے مسلمانوں کی برادری سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ وہ تمام طریقے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے ثابت نہیں ہیں، اور ان کو دین کا حصہ بنالیا گیا ہے، وہ سب "بدعات" کی فہرست میں شامل ہیں، اور یہ آیت کریمہ جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی یہ ان کی ممانعت کررہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔

شب برأت میں حلوہ گناہ کیوں؟

مثلاً شب برأت میں حلوہ پکنا چاہیے، اور یہ حلوہ شب برأت کا لازمی حصہ بن گیا ہے، اگر حلوہ نہیں پکا تو شب برأت ہی نہیں ہوئی۔ یا مثلاً رجب میں کونڈے ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص کونڈے نہ کرے تو وہ ملامتی ہے، وہ وہابی ہے، اس پر طرح طرح کی طعن و تشنیع کی جاتی ہے۔ اب اگر ان سے پوچھا جائے کہ کیا کونڈے کا حکم قرآن کریم میں کہیں آیا ہے؟ یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا؟ یا صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا تھا؟ کوئی ثبوت نہیں، بس اپنی طرف سے ایک طریقہ جاری کر کے اس کو اس طرح لازمی قرار دیدیا گیا کہ اگر کوئی نہ کرے تو وہ لعنت و ملامت کا مستحق ہے، اس کو "بدعت" کہتے ہیں، اب اگر ان سے یہ کہا جائے کہ یہ عمل تو "بدعت" ہے، تو جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کوئی گناہ کا کام کررہے ہیں؟ ہم کوئی چوری ڈاکہ ڈال رہے ہیں؟ بلکہ اپنے گھر کے ہی آٹے سے یہ پوریاں بنائیں، اور یہ حلوہ بنایا، اور اس کو محلہ میں تقسیم کردیا، اس میں گناہ کی کیا بات ہوئی؟ ارے بھائی! تم روزانہ پوری بناؤ،

روزانہ حلوہ بناؤ، اور اس کو تقسیم کرو، کوئی گناہ کی بات نہیں۔ لیکن اس کو دین کا لازمی حصہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ جو شخص یہ کام نہیں کر رہا، وہ ملامت کا مستحق ہے، تمہارا یہ طرز عمل اس کام کو "بدعت" بنا دیتا ہے، جس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ

اور جو شخص اس عمل کو کسی اتھارٹی کے بغیر دین کا حصہ بناتا ہے، وہ شخص اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔

ایصال ثواب کا صحیح طریقہ

یا مثلاً شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو اس کے عزیز و اقارب اس کے لئے ایصال ثواب کریں، کوئی بھی نیک عمل کر کے اس کا ثواب اس کو پہنچائیں، اتنی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے۔ مثلاً تلاوت قرآن کریم کے ذریعے کسی کو ثواب پہنچائیں، نفلیں پڑھ کر پہنچائیں، تسبیحات پڑھ کر پہنچائیں، حج کر کے ثواب پہنچائیں، روزہ رکھ کر پہنچائیں، طواف کر کے ثواب پہنچائیں، عمرہ کر کے ثواب پہنچائیں، یہ سب جائز ہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ایصال کرنا ثابت ہے۔ لیکن اس ایصال ثواب کے لئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا کہ بس اسی طریقے سے کرنا ہوگا، بلکہ سہولت کے ساتھ آدمی کو جس عبادت کا موقع ہو، اس عبادت کے ذریعہ ایصال ثواب کر دے، مثلاً کسی کو تلاوت کے ذریعہ ایصال

ثواب کرنے کا موقع ہے، وہ تلاوت کے ذریعہ ایصال کردے، اگر نفلیں پڑھ کر ایصال ثواب کرنے کا موقع ہو تو نفلیں پڑھ کر ایصال ثواب کردے۔ بس اخلاص کے ساتھ ایصال ثواب کردے، شرعاً ایصال ثواب کے لئے نہ تو دن مقرر ہے نہ وقت مقرر ہے، نہ اس کے لئے کوئی طریقہ مقرر ہے، نہ تقریب مقرر ہے۔

تیجہ کرنا گناہ کیوں؟

لیکن لوگوں نے یہ طریقہ اپنی طرف سے مقرر کرلیا کہ مرنے کے تیسرے دن سب کا جمع ہونا ضروری ہے، اس دن سب ملکر قرآن خوانی کریں گے، اور جس جگہ "تیجہ" ہوگا، وہاں کھانے کی دعوت بھی ہوگی۔ اگر ویسے ہی پہلے دن یا دوسرے دن یا تیسرے دن قرآن شریف اکیلے پڑھ لیتے، لوگوں کے آنے کی وجہ سے جمع ہوکر پڑھ لیتے تو یہ طریقہ اصلاً جائز تھا، لیکن یہ تخصیص کرنا کہ تیسرے دن ہی قرآن خوانی ہوگی، اور سب ملکر ہی کریں گے، اور اس میں دعوت ضرور ہوگی، اور جو ایسا نہ کرے وہ "وہابی" ہے، جب اس مخصوص طریقہ کو دین کا لازمی حصہ قرار دیدیا کہ اس کے بغیر دین مکمل نہیں، اور اگر کوئی عمل نہ کرے تو عمل نہ کرنے کے نتیجے میں اس کو مطعون کیا جائے، اس کو گناہ گار قرار دیا جائے، تو یہی چیز اس عمل کو بدعت بنادیتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی میت کا تیجہ نہ ہوا تو کہنے والے اس میت کو طعنہ دیتے ہیں کہ:

مرگیا مردود، نہ فاتحہ نہ درود

اس طرح اس میت پر طعنہ ہو رہا ہے، جو بیچارہ دنیا سے چلا گیا۔ بس لازمی سمجھنے اور طعنہ دینے نے اس عمل کو بدعت بنادیا، ورنہ ضروری سمجھے بغیر جس دن چاہو ایصال ثواب کرلو، پہلے دن کرلو، دوسرے دن کرلو، تیسرے دن کرلو،

چوتھے دن کرلو، پانچویں دن کرلو، مگر یہ تیجہ، دسواں، چالیسواں یہ سب بدعت ہیں۔

عید کے دن گلے ملنا بدعت کیوں؟

اسی طرح ہمارے یہاں یہ عام دستور ہے کہ عید کے دن عید کی نماز کے بعد آپس میں گلے ملتے ہیں، اور معانقہ کرتے ہیں۔ اب معانقہ کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں، جائز ہے، لیکن گلے ملنا اس وقت سنت ہے جب کوئی شخص سفر سے آیا ہے، اور اس سے پہلی ملاقات ہو رہی ہے، تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ اس سے گلے ملا جائے، اور معانقہ کیا جائے، عام حالات میں معانقہ کرنا سنت بھی نہیں، اور گناہ بھی نہیں، مثلاً ایک مسلمان بھائی آپ سے ملنے کے لئے آیا، آپ کا دل چاہا کہ اس سے گلے ملوں، آپ نے اسے گلے سے لگالیا تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس میں نہ تو کوئی گناہ ہے، اور نہ یہ عمل سنت ہے، اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ عید کے روز عید کی نماز کے بعد گلے ملنا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، یا یہ عمل دین کا حصہ ہے، یا اگر گلے نہ ملے تو گویا کہ عید ہی نہ ہوئی، یا گناہ کا ارتکاب ہو گیا، یا دین میں خلل واقع ہو گیا، اگر اس عقیدے کی وجہ سے کوئی شخص عید کے دن گلے مل رہا ہے تو گلے ملنا بھی بدعت اور ناجائز ہے، اگر سادہ طریقے سے صرف اپنی خوشی کے اظہار کے لئے گلے مل رہا ہے تو ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو سنت سمجھنا، اور اس کو عید کا لازمی حصہ قرار دینا اس عمل کو بدعت بنا دیتا ہے۔

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا حکم

اسی طرح فرض نماز کے بعد دعا کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد دعا فرمایا کرتے تھے، لیکن حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دعا اس طرح ہوتی تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے طور پر دعا فرمارہے ہیں، اور صحابہ کرام اپنے طور پر دعا فرمارہے ہیں۔ آج کل دعا کا جو طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ امام دعا کے الفاظ کہتا ہے اور باقی لوگ اس پر آمین کہتے ہیں، یہ طریقہ روایات میں کہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ لیکن یہ طریقہ ناجائز بھی نہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناجائز بھی نہیں کیا، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ طریقہ اختیار کرے تو کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص دعا کے اس طریقے کو لازمی قرار دیدے، اور اس کو نماز کا ضروری حصہ بنادے، اور اس طریقے پر دعا نہ کرنے والے پر طعن و تشنیع کرے تو اس صورت میں یہ عمل "بدعت" ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حضرات نے یہاں دیکھا ہوگا کہ میں جمعہ کی نماز کے بعد کبھی اجتماعی دعا کراتا ہوں، اور کبھی چھوڑ دیتا ہوں، جب پہلی مرتبہ میں نے دعا نہیں کرائی تو بہت سے لوگوں نے سوال کیا کہ حضرت! آپ نے دعا چھوڑ دی؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے اسی لئے چھوڑی کہ لوگوں کے دلوں اس دعا کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ یہ دعا نماز کا لازمی حصہ ہے، اور جب دعا چھوڑ دی تو لوگوں کو اشکال ہو گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اجتماعی دعا کے بغیر نماز نامکمل ہے۔ بس یہ خیال اس کو "بدعت" بنادیتا ہے، اس لئے کبھی دعا کر لینی چاہیے اور کبھی چھوڑ دینے چاہیے۔

پھر یہ عمل جائز ہے

جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ "تیجہ" کرنا بدعت ہے، "چالیسواں" کرنا بدعت ہے، تو جواب میں عام طور پر لوگ یہی کہتے ہیں کہ ہم تو کوئی گناہ کا کام

نہیں کر رہے، بلکہ ہم تو قرآن شریف پڑھ رہے ہیں، اور لوگوں کی دعوت کر رہے ہیں، اور نہ قرآن شریف پڑھنا گناہ ہے، اور نہ لوگوں کی دعوت کرنا گناہ ہے۔ بیشک یہ دونوں گناہ نہیں، بشرطیکہ ان کو لازم مت سمجھو، اور اگر کوئی شخص اس میں شریک نہ ہو تو اس کو طعنہ مت دو، اور اس عمل کو دین کا حصہ مت سمجھو، تو پھر یہ عمل بیشک جائز ہے۔ جو آیت کریمہ میں نے تلاوت کی، اس کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ اور اللہ کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو" اس مفہوم میں یہ سب بدعات بھی داخل ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑ کر اس کو لازمی قرار دیدیا جائے، اور جو شخص وہ طریقہ اختیار نہ کرے، اس کو مطعون کیا جائے۔

قبروں پر پھول کی چادر چڑھانا

اسی طرح قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا "بدعت" میں داخل ہے، دیکھئے! ویسے ہی آپ کا دل چاہا کہ میں اپنے باپ کی قبر پر چادر چڑھاؤں، چنانچہ اس کو دین کا حصہ اور ثواب سمجھے بغیر آپ نے قبر پر چادر چڑھادی تو یہ جائز ہے۔ لیکن اس کو دین کا حصہ قرار دینا، اور باعث اجر و ثواب قرار دینا، اور اگر کوئی شخص نہ چڑھائے تو اس پر طعنہ دینا، اور یہ کہنا کہ اس نے میت کی تعظیم میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے، یہ چیزیں اس عمل کو بدعت بنادیتی ہیں۔ جو چیز جس حد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے، اس کو اس کی حد سے آگے بڑھانا، مثلاً جو عمل مستحب ہے، اس کو سنت کا درجہ دینا، اور جو عمل سنت ہے، اس کو واجب کا درجہ دینا، یہ سب بدعت میں داخل ہے، اور اس آیت "لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" کی ممانعت کے تحت داخل ہے۔

خلاصہ

یہ "بدعت" کا مختصر مفہوم ہے، جس کا حکم اس آیت کریمہ سے نکل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے دلوں میں صحیح بات اتار دے، اور دین کا صحیح مطلب ہماری سمجھ میں آجائے، دین کی صحیح تشریح اور تعبیر ہماری سمجھ میں آجائے، اور ہماری زندگی اپنی رضا کے مطابق قبول فرمالے، آمین۔ خوب سمجھ لیں کہ اس بیان کے ذریعہ کسی پر اعتراض کرنا مقصود نہیں، کسی پر ملامت کرنا مقصود نہیں، ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے، ہم سب کو اپنی اپنی قبروں میں سونا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے، لہٰذا کسی بات پر ڈٹنے اور اڑنے کی بات نہیں کہ یہ طریقہ تو ہمارے باپ دادا سے چلا آرہا ہے، لہٰذا اس کو کیسے چھوڑیں؟ اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں یہ بات ڈال دے کہ دین جو کچھ ہے وہ جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، اس سے آگے بڑھ کر جو کام کیا جارہا ہے وہ دین نہیں ہوسکتا، چاہے اس کا رواج صدیوں سے چلا آرہا ہو، اور وہ کام قابل ترک ہے، اور چھوڑنے کے قابل ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

آواز بلند نہ کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آواز بلند نہ کریں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ نَبِیَّنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی ط لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ○ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (سورۃ الحجرات: ۲ تا ۵)

آمنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم ونحن علی ذلک من الشاھدین و الشاکرین والحمد للہ ربّ العلمین۔

تمہید

بزرگان محترم و برادران عزیز! یہ سورۃ الحجرات کی ابتدائی چند آیات ہیں، جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، پہلے ان آیات کا ترجمہ عرض کرتا ہوں، اس کے بعد ان کی تشریح عرض کروں گا، ان آیات کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند مت کرو، اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر ایک دوسرے سے بولا کرتے ہو، کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں، اور تم کو خبر بھی نہ ہو، بیشک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پست رکھتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خالص کر دیا ہے، ان لوگوں کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے، جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر لوگوں کو عقل نہیں ہے، اگر یہ لوگ صبر کرتے، یہاں تک کہ آپ خود باہر ان کے پاس آجاتے تو یہ ان کے لئے بہتر تھا، اللہ تعالیٰ بخشنے والے بڑے رحیم ہیں۔

دو حکم

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو دو حکم دیے گئے ہیں، ایک یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں صحابہ کرام کو آواز بلند کرنے سے منع فرمایا ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں بیٹھے ہوں تو اپنی

آواز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند نہ کی جائے، اور آپ سے پست آواز میں بات کی جائے۔ دوسرا حکم یہ دیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تشریف فرما ہوں تو اس وقت گھر کے باہر سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دینا، جیسا کہ بنو تمیم کے لوگوں نے ناواقفیت کی بناء پر ایسا طرز عمل اختیار کیا تھا کہ گھر کے باہر سے ہی آپ کو آواز دینا شروع کر دیں کہ "یَا مُحَمَّدُ اُخْرُجْ اِلَیْنَا" اے محمد! ہمارے لئے باہر آیئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ ایسا کر رہے ہیں ان کو سمجھ نہیں ہے، پھر فرمایا اگر وہ صبر کرتے، یہاں تک کہ آپ خود سے باہر تشریف لے آتے، اس وقت یہ لوگ آپ کی زیارت کرتے، اور آپ سے ملاقات کرتے تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتر تھا۔ بہر حال! یہ دو حکم ان آیات میں بیان فرمائے ہیں۔

مجلس نبوی کا ایک ادب

پہلے حکم میں دراصل مجلس نبوی کا ایک ادب بیان فرمایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا، یا بلند آواز سے اس طرح گفتگو کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے محابا گفتگو کیا کرتے ہیں، یہ ایک قسم کی بے ادبی اور گستاخی ہے، چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام ڈر گئے، اور ان کی یہ حالت ہوگئی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قسم ہے کہ اب مرتے دم تک میں آپ سے اس طرح بولوں گا جیسے کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات ان سے دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا کہ آپ نے کیا کہا۔ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ

تعالیٰ عنہ طبعی طور پر بہت بلند آواز تھے، یہ آیت سن کر بہت ڈر گئے، اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا۔

دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے

یہ حکم اگرچہ براہ راست حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق دیا گیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایسا نہ کریں، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ادنیٰ تکلیف پہنچانا انسان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے، اس لئے فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اس عمل سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف پہنچے، اور اس کے نتیجے میں تمہارے سارے اعمال غارت ہو جائیں، لیکن اس کے ضمن میں ایک عمومی ہدایت یہ بھی دی گئی ہے کہ کسی بھی انسان کو دوسرے انسان سے کوئی تکلیف نہ پہنچے، حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَ یَدِہٖ

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ یہ حکم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں تو انتہائی سنگین ہے، لیکن اگر کسی اور انسان کے ساتھ بھی ناحق معاملہ کیا جائے، خاص طور پر اس وقت جب کہ وہ ''مسلمان'' بھی ہو، یہ بھی گناہ ہے، اور انسان کے لئے قابل احتراز ہے۔

بلند آواز سے بات کرنا پسندیدہ نہیں

یہ جو حکم فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اپنی آواز بلند مت کرو، بلکہ آہستہ آواز سے بات کرو، یہ حکم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو بہت زیادہ مؤکد ہے، لیکن قرآن کریم نے دوسری جگہ عام

انسانوں کی گفتگو میں بھی بہت زیادہ بلند آواز سے بات کرنے کو پسند نہیں فرمایا، چنانچہ سورۂ لقمان میں فرمایا:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ، اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (سورة القمان:١٩)

یعنی اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو، اور اپنی آواز کو آہستہ کرو، بیشک سب سے بدترین آواز گدھے کی آواز ہے۔ اس لئے کہ گدھے کی آواز بلند ہوتی ہے، اور دور تک جاتی ہے، لہٰذا یہ اچھی بات نہیں کہ آدمی اتنی زور سے بولے جو ضرورت سے زیادہ ہو، اور اس کی وجہ سے دوسرے انسان کو تکلیف ہو۔

بلند آواز سے کان میں خلل ہو جانا

آج کل کے اطباء اور ڈاکٹر صاحبان یہ کہتے ہیں کہ اگر آدمی بہت زیادہ بلند آواز میں باتیں کرتا رہے اور دوسرے کے کان میں مسلسل وہ آواز جائے، تو اس کے نتیجے میں انسان کے کان میں خلل پیدا ہو جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ اس کے سننے کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا اتنی زور سے بولنا جو دوسرے انسان کی تکلیف کا سبب ہو، اس سے منع کیا گیا ہے، یہاں تک کہ جب آدمی کسی مجمع سے خطاب کر رہا ہو تو اس کے بارے میں بھی ادب یہ ہے کہ آواز صرف اتنی بلند کی جائے کہ مجمع کے آخر میں بیٹھنے والے تک آواز پہنچ جائے، اس سے زیادہ بلند کرنا ادب کے خلاف ہے، پسندیدہ نہیں ہے، خاص طور پر اس وقت جب اس بلند آواز کے نتیجے میں آس پاس کے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو، تو یہ کبیرہ گناہ ہے، کیونکہ آپ ناحق لوگوں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں۔

لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال

جب سے یہ "لاؤڈ اسپیکر" وجود میں آیا ہے، اللہ بچائے اس وقت سے ہمارے معاشرے میں اس کا اتنا غلط استعمال ہو رہا ہے، جو سراسر گناہ ہے، بعض اوقات لوگ اپنی تقریبات میں شادیوں میں لاؤڈ اسپیکر پر گانا بلند آواز سے لگا دیتے ہیں، اول تو گانا بجانا ہی ناجائز ہے، اور پھر وہ آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے سارے محلہ والے پریشان ہوتے ہیں، اگر کوئی سونا چاہتا ہے تو وہ سو نہیں سکتا۔ اگر کوئی بیمار ہے اور وہ سکون چاہتا ہے تو اس کو سکون نہیں ملتا، اس طرح اس ایک عمل کی وجہ سے ڈبل گناہ ہو رہا ہے، ایک ناجائز بات کی تشہیر کرنے کا گناہ، دوسرے لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کرنے کا گناہ۔

دین کے نام پر ناجائز کام کرنا

افسوس یہ ہے کہ جو گانا بجانے والے لوگ ہیں، ان کو تو چلو فکر ہی نہیں ہے کہ کیا چیز گناہ ہے اور کیا ثواب ہے؟ لیکن جو لوگ دین کے نام پر کام کرنے والے ہیں، جن کو دین کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے، ان کو بھی اس مسئلے کا اہتمام نہیں، چنانچہ لاؤڈ اسپیکر پر وعظ و تقریر ہو رہی ہے، یا نعتیں پڑھی جا رہی ہیں، یا قوالی ہو رہی ہے، اب اس کی وجہ سے سارا محلہ جاگ رہا ہے، جب تک وہ پروگرام ختم نہیں ہوگا، اس وقت تک کوئی آدمی سو نہیں سکتا، اس میں بھی ڈبل گناہ ہے، اس لئے کہ یہ گناہ کا کام دین کے نام پر کیا جا رہا ہے، اگر کوئی بیمار اس آواز کی وجہ سے پریشان ہے، اور تکلیف میں ہے، لیکن وہ اس لئے کچھ نہیں کہتا کہ اس کو یہ ڈر ہے کہ یہ تو وعظ اور تقریر ہو رہی ہے، میرا کچھ کہنا دین کے خلاف نہ ہو جائے، اس ڈر سے لوگ خاموش رہتے ہیں، حالانکہ یہ سنگین گناہ ہے۔

ایک واعظ کا واقعہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ روایت میں آتا ہے کہ آپ جس حجرہ میں مقیم تھیں، اور جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ اقدس واقع ہے، بعض اوقات ایک واعظ صاحب وعظ کہنے کے لئے آتے، اور مسجد نبوی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کے سامنے بلند آواز سے وعظ کہنا شروع کر دیتے تھے، اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر تو نہیں تھا، لیکن آواز بہت بلند تھی، کافی دیر تک وہ تقریر کرتے رہتے تھے، ان کی آواز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ میں آتی تھی، اب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنی عبادت یا کام میں مشغول ہوتیں، یا آرام کر رہی ہوتیں تو اس آواز سے ان کو تکلیف ہوتی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس وقت کے خلیفہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس شکایت کی کہ یہ واعظ صاحب یہاں آکر اتنی بلند آواز سے تقریر کرتے ہیں کہ مجھے اس کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو بلوایا، اور ان کو سمجھایا کہ بیشک دین کی بات کہنا بڑی اچھی بات ہے، لیکن اس طرح کہنا چاہیے جس سے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے، لہٰذا آئندہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کے سامنے اس طرح تقریر مت کرنا، اگر وعظ کرنا ہے تو کسی اور جگہ پر جا کر کرو، اگر وہیں پر وعظ کرنا ہے تو اتنی آواز سے کرو کہ وہ آواز صرف سننے والوں کی حد تک محدود رہے، دور تک نہ جائے۔

مار مار کر یہ سونٹا توڑ دوں گا

کچھ دن تک تو وہ واعظ صاحب خاموش رہے۔ لیکن بعض لوگ جذباتی

قسم کے ہوتے ہیں، ان کو وعظ کے بغیر چین نہیں آتا، وہ صاحب بھی اسی طرح کے تھے، چنانچہ چند روز کے بعد دوبارہ اسی طرح مجمع جمع کیا، اور بڑی زور سے تقریر شروع کر دی، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دوبارہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شکایت کی کہ ان صاحب نے دوبارہ وہی سلسلہ شروع کر دیا ہے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان صاحب کو بلایا، اور فرمایا میں نے پہلی مرتبہ تم کو سمجھایا تھا، معلوم ہوا کہ تم نے دوبارہ یہ حرکت شروع کر دی ہے، اب اگر تیسری مرتبہ تمہاری یہ شکایت آئی تو پھر یہ جو میرے ہاتھ میں سونٹا ہے، اس کے ذریعے مار مار کر یہ سونٹا توڑ دوں گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شکایت پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اتنے سخت الفاظ اس واعظ سے ارشاد فرمائے۔

بلند آواز سے قرآن شریف پڑھنا

اس مسئلہ میں کسی فقیہ کا کسی امام کا اختلاف نہیں، ساری امت کے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ایسی بلند آواز سے کوئی بھی کام کرنا، چاہے وہ دین کا کام ہو، جس سے دوسرے لوگوں کے کاموں مین اس طرح خلل واقع ہو کہ اگر کوئی سونا چاہے تو وہ نہیں سو سکتا، اگر کوئی بیمار ہے تو اس کی وجہ سے وہ تکلیف میں مبتلا ہے، ایسا کام کرنا بالکل حرام ہے، اور اگر ایسا کام دین کے نام کیا جائے تو ڈبل حرام ہے، اس لئے کہ اس کے ذریعے سے دین کی غلط نمائندگی کی جارہی ہے۔ چنانچہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ ایسی جگہ پر قرآن کریم بلند آواز سے نہ پڑھیں، جہاں لوگ سو رہے ہوں، یا جہاں پر لوگ اپنے کاموں کے اندر مشغول ہیں، اور اس کے نتیجے میں وہ یا تو قرآن کریم سے بے التفاتی برتیں گے، یا ان

کے کاموں میں خلل واقع ہوگا، اس طرح کے بے شمار احکام ہمیں شریعت نے بتائے ہیں کہ دین کا کام بھی اس طرح کرو کہ اس سے حتی الامکان دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔

تہجد کے لئے اٹھتے وقت آپ کا انداز

حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے تھے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سو رہی ہوتی تھیں تو آپ کس انداز سے اٹھتے تھے؟ اس کے بارے میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

قَامَ رُوَيْدًا وَ فَتَحَ الْبَابَ رُوَيْدًا

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم دھیرے سے اٹھتے تھے، اور دروازہ دھیرے سے کھولتے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آنکھ کھل جائے، حالانکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آنکھ کھل بھی جاتی تو شاید ان کو تکلیف محسوس بھی نہ ہوتی، بلکہ وہ اس کو اپنے لئے سعادت سمجھتیں، اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش یہ تھی کہ میرے کسی عمل سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ادنیٰ تکلیف بھی نہ پہنچے، اور ان کی نیند میں خلل واقع نہ ہو، نماز پڑھ رہے ہیں تو اس انداز سے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تکلیف نہ ہو۔ یہ ہے ہمارا دین، جس نے ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے دین کے احکام اور تعلیمات سے غافل ہو کر جو سمجھ میں آرہا ہے کر رہے ہیں، اور پھر اس کو اپنے دین کی طرف منسوب کر رہے ہیں، یہ انتہائی خطرناک بات ہے،

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

قانون کب حرکت میں آتا ہے

بہرحال! لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جس بری طرح ہو رہا ہے، اور جس طرح لوگوں کے لئے تکلیف کا سبب بن رہا ہے، جب کہ حکومت نے بھی یہ قانون بنا رکھا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال نہ ہو، لیکن اس معاشرے میں قانون کی کوئی وقعت کوئی قیمت نہیں، یہ قانون صرف اس وقت حرکت میں آتا ہے، جب حکومت کو کسی شخص سے عداوت ہو جائے، اس وقت "لاؤڈ اسپیکر ایکٹ" سامنے آ جاتا ہے، لیکن آج دن رات اس قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، مگر کوئی دیکھنے والا، کوئی سننے والا نہیں۔ بہرحال! ان آیات نے ہمیں ایک ہدایت تو یہ دی کہ آواز بھی اتنی رکھو جس سے مقصد حاصل ہو جائے، آپ کو ایک پیغام پہنچانا ہے تو جس آواز سے دوسرا سن لے بس اس حد پر اس آواز کو رکھو، اس سے زیادہ آواز کو بڑھانا جو دوسروں کی تکلیف کا سبب بن جائے، اس سے ان آیات میں منع فرمایا گیا ہے۔

اللہ کے ذکر کے لئے آواز پست رکھنے کا حکم

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ میں تشریف لے جا رہے تھے، صحابہ کرام ساتھ تھے، رات کے وقت سفر ہو رہا تھا، سفر کے دوران بسا اوقات لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح وقت کٹے، چنانچہ صحابہ کرام نے سفر کے دوران بلند آواز سے ذکر شروع کر دیا، اور اللہ تعالیٰ کی تحمید و تقدیس بلند آواز سے شروع کر دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کرام سے خطاب کر کے فرمایا:

اِنَّکُمْ لَاتَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا

یعنی تم بہری ذات کو نہیں پکار رہے ہو، اور نہ کسی ایسی شخصیت کو پکار رہے ہو جو تم سے غائب ہے، بلکہ تم تو اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہو، اور اس کو پکارنے کے لئے بلند آواز کی ضرورت نہیں، اگر تم آہستہ آواز سے بھی پکارو گے تو اللہ تعالیٰ سن لیں گے، اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ موجود ہے، اور ہر ایک کی بات سنتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم قرآن کریم کے عین مطابق دی، اس لئے کہ قرآن کریم میں ہے:

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً

یعنی اپنے رب کو عاجزی کے ساتھ اور آہستگی سے پکارو۔ اس لئے دعا میں، ذکر میں، درود شریف میں آواز بلند کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو سنانا مقصود ہے، اور اللہ تعالیٰ کو سنانے کے لئے آواز کو بلند کرنے کی ضرورت نہیں، آہستگی سے بھی کرو گے تو اللہ تعالیٰ سن لیں گے۔

آواز نکلنا بڑی نعمت ہے

یہ آواز کی نعمت جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے رکھی ہے، یہ ایسی نعمت ہے کہ اگر کبھی یہ نعمت سلب ہو جائے، تو اس وقت انسان اس کو حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا، جب آواز بند ہو جاتی ہے تو آدمی کو ایسی بے چینی اور بے تابی ہو جاتی ہے کہ آدمی اپنے دل کی بات کہنا چاہتا ہے، لیکن نہیں کہہ سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں گھر بیٹھے مفت میں یہ دولت دے رکھی ہے، اور اس کے ذریعہ ہم اپنی آواز دوسروں تک پہنچا کر اپنا مفہوم واضح کر دیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، لہٰذا ایک طرف تو اس کا شکر ادا کرنا

چاہیے، دوسرے یہ کہ اس کو صحیح جگہ پر استعمال کرنا چاہیے، غلط جگہ پر استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے، اور حد سے زیادہ استعمال نہ ہو، بس جتنی ضرورت ہے اتنی ہی استعمال ہو۔

خلاصہ

یہ سب دین کے احکام ہیں جو ہمیں ان آیات سے مل رہے ہیں، افسوس یہ ہے کہ ہم نے دین کو نماز روزے کی حد تک محدود کرلیا ہے، اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو ہدایات عطا فرمائی ہیں، ان کو ہم دین کا حصہ ہی نہیں سمجھتے، جس کی وجہ سے آج ہم معاشرتی فساد میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اپنے دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

ملاقات
اور فون کرنے کے آداب

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۶

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

ملاقات اور فون کرنے کے آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ، وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ نَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُ فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ٥ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ٥ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَایَعْقِلُوْنَ ٥ وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ٥ (سورۃ الحجرات: ٤، ٥)

آمنت باللّٰہ صدق اللّٰہ مولانا العظیم وصدق رسولہ النبی الکریم ونحن علی ذلک من الشاھدین و الشاکرین والحمد للّٰہ ربّ العٰلمین۔

تمہید

بزرگان محترم و برادران عزیز! سورۃ حجرات کی تفسیر کا بیان کئی جمعوں سے چل رہا ہے، آج میں نے آپ کے سامنے اس کی دو آیات تلاوت کیں، ان میں سے پہلی آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

جو لوگ آپ کو آپ کے حجروں یعنی رہائش گاہ کے پیچھے سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر لوگ نا سمجھ ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ بنو تمیم کا ایک وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تھا، ان کے اندر آداب اور تہذیب کی کمی تھی، چنانچہ ان لوگوں نے اس وقت جبکہ آپ کے آرام کا وقت تھا، آپ کے مکان کے پیچھے سے آپ کو پکارنا شروع کر دیا کہ "یا محمد اخرج الینا" اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ باہر تشریف لائیں، ہم آپ سے ملنے آئے ہیں۔ یہ آیت کریمہ ان کے بارے میں نازل ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکار رہے ہیں، ان میں سے اکثر لوگ نا سمجھ ہیں، اگر یہ لوگ آپ کو پکارنے کے بجائے باہر صبر کرتے، اور انتظار کرتے، یہاں تک کہ آپ خود سے باہر تشریف لے آتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا، لیکن ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا کہ چونکہ یہ عمل ان سے نادانی میں سرزد ہوا ہے، اس لئے ان کو معاف کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے، بڑا مغفرت کرنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے، لیکن آئندہ کے لئے سبق دیدیا۔

دور سے بلانا ادب کے خلاف ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو سبق دیے، ایک سبق یہ دیا کہ کسی بڑے کو دور سے پکارنا بے ادبی ہے، چاہے یہ پکارنا گھر کے باہر سے ہو، یا کسی اور جگہ سے ہو، اگر کسی بڑے سے آپ کو کوئی کام ہے تو اس کے قریب جا کر اس سے بات کریں۔ بلکہ عام انسانوں میں بھی یہ بے ادبی کی بات ہے، مثلاً کوئی بیٹا باپ کو اس طرح دور سے پکارے، یا کوئی شخص اپنے سے بڑے رشتے دار کو دور سے پکارے، یہ سب بے ادبی کے اندر داخل ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو یہ بے ادبی

بڑی ہی سنگین ہے، اسی لئے قرآن کریم نے یہ طریقہ بتادیا کہ دور سے آواز دینے کے بجائے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جاؤ، اور پھر جو درخواست کرنی ہو "یارسول اللہ" کہہ کر درخواست کرو۔

حضور اقدس ﷺ پر درود وسلام کا طریقہ

فقہاء کرام نے اسی آیت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے جانے کے باوجود اپنی قبر مبارک میں تشریف فرما ہیں، اور آپ کو ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے، جس طرح شہداء کے بارے میں فرمایا کہ وہ شہداء مرتے نہیں ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں احساس نہیں ہوتا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا معاملہ شہداء سے بھی اونچا ہے، وہ بھی زندہ ہیں، اور خاص قسم کی زندگی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرما رکھی ہے، جو ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ اسی لئے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر جاؤ تو وہاں جا کر کہو:

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے سلام پیش کرو، لیکن جب تم روضہ اقدس سے دور ہو تو پھر تم یوں کہو:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ

لہٰذا اس آیت کی رو سے روضہ اقدس سے دور ہونے کی صورت میں "الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" کہنا درست نہیں، کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دور سے پکارنا بے ادبی کی بات ہے، اور یہ آپ کی تعظیم کے خلاف ہے۔

حاضر و ناظر کے عقیدے سے پکارنا

خاص طور پر "الصلوۃ والسلام علیك یارسول اللّٰہ" کے الفاظ سے اس عقیدے سے پکارنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ موجود ہیں، اور آپ حاضر و ناظر ہیں۔ اللہ بچائے۔ یہ عقیدہ انسان کو بعض اوقات شرک تک پہنچا دیتا ہے، اور اگر اس عقیدے سے یہ الفاظ کسی نے کہے کہ جب ہم "الصلوۃ والسلام علیك یارسول اللّٰہ" کہہ کر درود بھیجتے ہیں تو آپ کی روح مبارک تشریف لاتی ہے، خوب سمجھ لیجئے یہ بات احادیث میں کہیں ثابت نہیں، دوسری طرف یہ آپ کی تعظیم کے بھی خلاف ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دور سے سلام کریں، اور سلام لینے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لائیں۔ آپ ذرا اندازہ کریں کہ ہم تو یہاں بیٹھ کر پکار رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک ہم سے سلام لینے کے لئے تشریف لائے، یہ کوئی ادب کی بات ہے؟ یہ کوئی تعظیم اور محبت کی بات ہے؟ صحیح طریقہ وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بیان فرما دیا، وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر پہ آکر مجھے سلام کرے گا، میں اس کا جواب دوں گا، اور جو شخص دور سے مجھ پر درود بھیجے گا تو وہ درود مجھ تک فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے کہ آپ کے فلاں امتی نے درود شریف کا یہ تحفہ پیش کیا ہے۔ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، جو حدیث میں منقول ہے۔

"یارسول اللہ" کہنا ادب کے خلاف ہے

لہٰذا آپ کی ظاہری زندگی میں جس طرح یہ حکم تھا کہ جو شخص بھی آپ سے خطاب کرے، وہ قریب جا کر کرے، دور سے نہ کرے، اسی طرح آپ کی وفات کے بعد جبکہ آپ کو قبر مبارک میں دوسری حیات طیبہ حاصل ہے، وہاں بھی یہی حکم

ہے کہ قریب جا کر ان الفاظ سے سلام کرو کہ:

الصلاۃ والسلام علیك یارسول اللّٰہ

لیکن دور سے کہنا ہے تو درود شریف پڑھو، ان الفاظ سے سلام کہنا آپ کی تعظیم اور ادب کے خلاف ہے۔ اس آیت سے ایک سبق تو یہ دیدیا۔

حضور کے دروازے پر دستک دینا

اس آیت سے دوسرا سبق یہ دیا کہ اگر کسی شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی کام ہے تو آپ کے دروازے پر دستک دے کر آپ کو باہر بلانا آپ کے ادب کے خلاف ہے، اگر کوئی بہت ضروری اور فوری کام ہو تو دوسری بات ہے، لیکن عام حالات میں آپ کے دروازے پر دستک دینا اور آپ کو باہر آنے کی زحمت دینا مناسب نہیں۔ لہٰذا اگر آپ سے کسی شخص کو کوئی کام ہے تو باہر بیٹھ کر انتظار کرے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود کسی ضرورت سے باہر تشریف لائیں، ظاہر ہے پانچ وقت کی نماز کے لئے تو آپ باہر تشریف لاتے ہی تھے، اس کے علاوہ اور اوقات میں بھی بعض مرتبہ آپ باہر تشریف لے آتے تھے، اس وقت ملاقات کر کے اپنی ضرورت پیش کرو، یہ طریقہ تمہارے لئے ہزار درجہ بہتر ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

یعنی اگر یہ لوگ صبر کر لیتے، یہاں تک کہ آپ خود باہر تشریف لے آتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ بنسبت اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دے کر باہر بلائیں۔

استاد کے دروازے پر دستک دینا

حضرات مفسرین نے اس آیت کے تحت یہ فرمایا کہ ہر شاگرد اور استاد کا

معاملہ بھی ایسا ہے، یعنی اگر کوئی شاگرد کسی استاد سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ شاگرد استاد کی خلوت میں خلل انداز ہو، اور استاد کے دروازے پر دستک دے کر اس کو باہر آنے کی دعوت دینے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس کا انتظار کرے، اور جب وہ استاد خود سے باہر آئے اس وقت جا کر ملاقات کرے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لئے حضور کی دعا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے تھے، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت ان کی عمر صرف دس سال تھی، لیکن دس سال کی عمر کے دوران ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بلا کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا فرمائی تھی کہ:

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَ عَلِّمْهُ التَّاْوِیْلَ (او کما قال)

اے اللہ! اس بچے کو دین کی سمجھ عطا فرما، اور اس کو قرآن کریم کی تفسیر کا علم عطا فرما، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا اس طرح قبول فرمائی کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، اور میں آپ سے قرآن کریم کی تفسیر کا علم حاصل نہ کر سکا، دل میں خیال آیا کہ ابھی بہت سے ایسے صحابہ کرام موجود ہیں جنہوں نے براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم حاصل کیا ہے، میں ان میں سے ایک ایک کے پاس جاؤں، اور جا کر ان سے علم حاصل کروں۔ چنانچہ جس کسی صحابی کے بارے میں مجھے علم ہوتا کہ ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں تو میں سفر کر کے ان کے پاس جاتا۔

علم سیکھنے کے لئے ادب کا لحاظ

خود فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ شدید گرمی کا موسم ہے، اور عرب کی گرمی تو بہت زیادہ شدید ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے آگ برس رہی ہے، اور زمین شعلے اگل رہی ہے، ایسی شدید گرمی میں سفر کر کے جاتا، اور جس صحابی سے علم حاصل کرنا مقصود ہوتا، اس صحابی کے دروازے پر جا کر بیٹھ جاتا، یہ پسند نہیں تھا کہ جس صحابی کو اپنا استاد بناتا ہے، اور ان سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث حاصل کرنی ہیں، ان کے دروازے پر دستک دے کر ان کو باہر آنے پر مجبور کروں، یہ مجھے گوارا نہیں تھا، اس لئے دروازے پر بیٹھ جاتا کہ جب وہ خود سے کسی وقت گھر سے باہر نکلیں گے تو ان سے اپنی درخواست پیش کروں گا۔ اور جب میں دروازے پر بیٹھا ہوتا تو ریت کا طوفان چل رہا ہوتا، سر سے لے کر پاؤں تک پورا جسم مٹی سے اٹ جاتا، لیکن اس وقت بھی یہ گوارا نہیں ہوتا کہ میں دستک دے کر ان کو باہر بلاؤں، اور جب وہ خود کسی وجہ سے باہر نکلتے اور دیکھتے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اس طرح دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں، تو وہ مجھے سینے سے لگاتے اور کہتے کہ آپ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے ہیں، آپ یہاں میرے گھر کے دروازے پر بیٹھے ہیں؟ آپ نے دستک دے کر مجھے کیوں نہیں بلالیا؟ اور گھر کے اندر کیوں تشریف نہیں لائے؟ میں عرض کرتا کہ آج میں آپ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے کی حیثیت سے نہیں آیا، بلکہ آج میں آپ کے شاگرد کی حیثیت سے آیا ہوں، اور آپ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننے کے لئے آیا ہوں، اس وجہ سے مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ آپ کو تکلیف دوں، اور آپ کو گھر سے باہر بلاؤں۔ چونکہ قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے بارے میں کہا تھا کہ بنوتمیم کے لوگوں کو چاہیے تھا کہ وہ باہر دروازے پر صبر کرتے، حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سے باہر تشریف لے آتے، اگر وہ ایسا کرتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اپنے استاد کے ساتھ وہی معاملہ کیا۔

جانے سے پہلے وقت لیلو

یہ تو استاد شاگرد، باپ بیٹے اور پیر مرید کے بارے میں اُصول تھا، لیکن عام انسانوں کے ساتھ ملاقاتوں میں بھی تلقین کی گئی کہ جس شخص سے تم ملنے جارہے ہو، حتی الامکان اس کو تکلیف پہنچانے سے گریز کرو، یہ نہ ہو کہ بس کسی بھی وقت مصیبت بن کر کسی کے گھر میں وارد ہوگئے، اور اس پر مسلط ہوگئے۔ بلکہ جب کسی کے پاس ملاقات کے لئے جانا ہو تو پہلے یہ دیکھو کہ یہ وقت اس شخص سے ملاقات کے لئے مناسب ہے یا نہیں؟ اس شخص کا نظم الاوقات کیا ہے؟ لوگوں کی عادتیں مختلف ہوتی ہیں، کوئی وقت کسی شخص کے آرام کا وقت ہوتا ہے، کسی وقت کوئی شخص خلوت اور تنہائی میں اپنے گھر والوں کے پاس رہنا چاہتا ہے، کوئی شخص کسی وقت مصروف ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے یہ معلوم کرلو کہ فلاں شخص سے ملاقات کے لئے کون سا وقت زیادہ موزوں ہے؟ کہ اس وقت ملاقات کرنے سے اس کو تکلف نہیں ہوگی۔

میزبان کے حقوق مہمان پر

جس طرح مہمان کے حقوق ہیں میزبان پر کہ جب کوئی مہمان آئے تو میزبان کو چاہیے کہ اس کا اکرام کرے، اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئے، اسی طرح میزبان کا بھی مہمان کے اوپر حق ہے، وہ یہ ہے کہ مہمان اس کے لئے مہمان بنے، وبال جان نہ بنے کہ ایسے وقت میں اس کے پاس پہنچ جائے جو اس

کے لئے مناسب نہیں تھا، لہٰذا علماء کرام نے اس آیت کے تحت یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ جب کسی سے ملنے کے لئے جاؤ تو یہ اندازہ کر کے جاؤ کہ اس وقت اس سے ملنا مناسب ہوگا یا نہیں؟ اس کے بغیر اگر جاؤ گے تو تکلیف کا سبب بنو گے، اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں دو رکوع اس موضوع پر نازل فرمائے ہیں کہ جب تم کسی سے ملاقات کے لئے جاؤ تو کس طرح جاؤ، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کے پاس جانے سے اس کو تکلیف نہ دو، جانے سے پہلے اجازت لو کہ میں فلاں وقت میں آؤں یا نہ آؤں؟ اور اگر دوسرا شخص معذرت کرلے کہ میں اس وقت مشغول ہوں، میں ملاقات نہیں کرسکتا تو اس کو برا نہ مناؤ، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ (سورۃ النور:)

یعنی اگر میزبان تم سے یہ کہے کہ اس وقت ملنا میرے مشکل ہے، میں کسی کام میں مشغول ہوں، میرے ساتھ معذوری لاحق ہے تو اس سے برا نہ مناؤ، بلکہ واپس چلے جاؤ، تمہارے لئے واپس جانا ہی بہتر ہے۔ ان تمام اصولوں کی بنیاد یہ ہے کہ تمہارے کسی عمل سے کسی شخص کو کوئی ناواجبی تکلیف نہ پہنچے۔ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے، وہ صحابی مدینہ منورہ سے دو تین میل کے فاصلے پر رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب کسی صحابی سے ملنے کے لئے اس کے گھر تشریف لے جاتے تو اجازت طلب کرنے کے لئے سلام کرتے کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، أ أدخل؟ کیا میں اندر آجاؤں؟ بہرحال ان صحابی کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر آپ نے

حسب معمول سلام کیا، اندر سے کوئی جواب نہ آیا، آپ نے دوبارہ سلام کیا، پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا، آپ نے تیسری مرتبہ سلام کیا، پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ وہ صحابہ کسی اور حال میں تھے، ان کے دل میں خیال آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دعا دے رہے ہیں، اس لئے کہ ''السلام علیکم و رحمة الله و بركاته'' کے معنی ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو، تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، تو ان صحابی نے یہ سوچا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ سے زیادہ دعائیں حاصل کرلوں، اس لئے وہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے۔ دوسری طرف جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ سلام کرلیا تو واپس جانے لگے، اس لئے کہ حکم یہ ہے کہ جب تین مرتبہ اجازت مانگ چکو، اور تمہیں یہ اندازہ ہو کہ تمہاری آواز اندر والے نے سن لی ہے تو تین مرتبہ اجازت مانگنے کے باوجود اگر وہ باہر نہ نکلے تو تم واپس چلے جاؤ، اس لئے کہ وہ شخص تم سے اس وقت نہیں ملنا چاہتا، اور خواہ مخواہ زبردستی دوسرے پر سوار ہو جانا اسلامی آداب کا تقاضا نہیں، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس جانے لگے۔ جب ان صحابی کو اندازہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے جا رہے ہیں، تو جلدی سے گھر سے باہر نکلے، اور جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور عرض کیا کہ آپ واپس کیوں جا رہے ہیں؟ گھر کے اندر تشریف لائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکم یہ ہے کہ تین مرتبہ اجازت مانگو، اور جب یہ اندازہ ہو کہ اس شخص نے تمہاری آواز سن لی ہے، اس کے باوجود وہ اندر آنے کی اجازت نہیں دے رہا ہے، تو واپس چلے جاؤ۔ اب دیکھئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برا نہیں منایا، اور یہ نہیں کہا کہ تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا، اور اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں دی، بلکہ واپس چلے گئے، ان صحابی نے فرمایا میں یہ سوچتا رہا کہ آپ کی دعائیں لیتا رہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دعائیں لینے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا، تم دعائیں ویسے لے لیتے، میں باہر کھڑا انتظار کرتا رہا، یہ اچھی بات نہیں ہے۔

حضور نے برا نہیں منایا

بہر حال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد جب اجازت نہیں ملی تو اس پر آپ نے برا نہیں منایا، اور نہ غصہ کیا کہ ہم تمہارے گھر پہ آئے، تم نے ہمارے سلام کا جواب نہیں دیا، بلکہ آپ واپس چلے گئے۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے یہ فرما دیا تھا کہ اگر تم سے یہ کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو اس وقت تم واپس چلے جاؤ، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہمان پر بھی میزبان کے کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں، وہ یہ کہ بلا وجہ اس کو تکلیف نہ پہنچائے۔

فون کرنے کے آداب

آج کل ملاقاتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے، اور وہ ٹیلی فون کے ذریعہ آدمی ملاقات ہے، اس میں بھی یہی احکام ہیں، میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں سورۃ النور کی تفسیر میں ٹیلی فون استعمال کرنے کے احکام بھی لکھے ہیں، وہ یہ کہ جب تم کسی کو ٹیلی فون کرو تو یہ دیکھو کہ میں ایسے وقت میں ٹیلی فون تو نہیں کر رہا ہوں جو اس کی تکلیف کا سبب ہو، بسا اوقات لوگ اس کا خیال نہیں کرتے، بس دماغ میں خیال آیا کہ فلاں سے فلاں بات کرنی ہے، اور اسی وقت فون کر دیا، یہ دیکھے بغیر کہ اس وقت یہ اس کے آرام کا وقت ہوگا، یا نماز کا وقت ہوگا، یا دوسری ضروریات کا وقت ہوگا۔ یہ بیچارہ "مولوی" تو ساری دنیا کی میراث ہے، اس سے ملاقات اور اس سے بات کرنے کے لئے کسی قاعدے اور قانون کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ میرے پاس تو رات کے دو بجے ٹیلی فون آجاتا ہے، ایک مرتبہ رات کے دو بجے فون آیا، میں نے پوچھا کہ فون کرنے سے پہلے گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا، اس وقت کیا ٹائم ہو رہا ہے؟ جواب دیا کہ ہاں: دیکھی تو تھی، لیکن یہ خیال تھا کہ شاید آپ اس وقت تہجد کے

لئے اٹھے ہوں گے، لہٰذا اس وقت آپ کو فون کرلیں۔ اب دو بجے رات کو فون کر رہے ہیں، اور مسئلہ بھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کی فوری ضرورت ہو، بلکہ عام مسئلہ کے لئے رات کے دو بجے فون کر رہے ہیں۔ آج اس بات کا خیال بھی دل سے اٹھ گیا کہ اگر کسی کو فون کریں تو ایسے وقت میں کریں کہ جس سے سامنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

لمبی بات کرنے سے پہلے اجازت لیلو

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ فون کی گھنٹی بجی، اور آپ نے ریسیور اٹھالیا، لیکن آپ جلدی میں ہیں، اور آپ کو فوراً کہیں جانا ہے، مثلاً آپ کے جہاز کا وقت ہے، یا دفتر میں پہنچنا ہے، اور یا بیت الخلاء کا تقاضا ہے، اب سامنے والے نے فون پر لمبی بات شروع کردی۔ اس لئے معارف القرآن میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر کسی سے فون پر لمبی بات کرنے ہو تو پہلے پوچھ لو کہ میں ذرا لمبی بات کرنا چاہتا ہوں، اگر اس وقت فارغ ہوں تو ابھی کرلوں، یا دوسرا وقت بتا دیں، میں اس وقت فون کرلوں گا، تاکہ اس کو تکلیف نہ ہو۔ یہ سارے آداب بھی دین کا حصہ ہیں، اسلام نے ان کی تعلیم دی ہے، لیکن ہم نے دین اسلام کو چند عبادتوں میں محدود کردیا ہے، اور معاشرت کے یہ احکام جو قرآن و حدیث میں بھرے ہوئے ہیں، ان کو دین سے خارج کردیا ہے، اس کے نتیجے میں ہماری زندگیوں میں ایک عجیب قسم کی بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔ سورۃ الحجرات کی یہ آیت ان تمام آداب کی طرف اشارہ کر رہی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی فہم عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

۲۶۷

ہر خبر کی تحقیق کرنا ضروری ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر خبر کی تحقیق کرنا ضروری ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○

(سورۃ الحجرات:۶)

تمہید و ترجمہ

بزرگان محترم و برادران عزیز! سورۃ حجرات کی تفسیر کا بیان کئی جمعوں

سے چل رہا ہے، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری معاشرتی زندگی سے متعلق بڑی اہم ہدایات عطا فرمائی ہیں، اسی سورۃ کی ایک آیت ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! اگر کوئی گناہ گار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم ذرا ہوشیاری سے کام لو، یعنی ہر شخص کی ہر بات پر اعتماد کر کے کوئی کارروائی نہ کرو، ہوشیاری سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تحقیق کرو کہ یہ خبر واقعی سچی ہے یا نہیں؟ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو ہو سکتا ہے کہ نادانی میں کچھ لوگوں کو تم نقصان پہنچا دو، اور بعد میں تمہیں اپنے فعل پر ندامت اور شرمساری ہو کہ ہم نے یہ کیا کر دیا۔ یہ آیت کریمہ کا ترجمہ ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات پر بھروسہ کر کے کوئی کارروائی نہ کیا کرے، بلکہ جو خبر ملے جب تک اس خبر کی پوری تحقیق نہ ہو جائے، اور جب تک وہ خبر صحیح ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک اس خبر کی بنیاد پر نہ کوئی بات کہنا جائز ہے اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی کارروائی کرنا جائز ہے۔

آیت کا شانِ نزول

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کریمہ ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی تھی، جس کو اصطلاح میں "شانِ نزول" کہا جاتا ہے، واقعہ یہ تھا کہ عرب میں ایک قبیلہ "بنو مصطلق" کے نام سے آباد تھا، بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضرار جن کی بیٹی جویریہ بنت حارث امہات المؤمنین میں سے ہیں۔ وہ خود اپنا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی، اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا،

میں نے اسلام قبول کرلیا، اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار کرلیا، اور میں نے عرض کیا کہ میں اپنی قوم میں واپس جا کر ان کو بھی اسلام کی اور ادائے زکوٰۃ کی دعوت دوں گا، جو لوگ میری بات مان لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے، ان کی زکوٰۃ جمع کرلوں گا، آپ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ تک اپنا کوئی قاصد بھیج دیں تاکہ زکوٰۃ کی جو رقم میرے پاس جمع ہو جائے، وہ ان کے سپرد کردوں۔

قاصد کے استقبال کے لئے بستی سے باہر نکلنا

حسب وعدہ جب حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایمان لانے والوں کی زکوٰۃ جمع کرلی، اور وہ مہینہ اور وہ تاریخ جو قاصد بھیجنے کے لئے طے ہوئی تھی گزر گئی، اور آپ کا کوئی قاصد نہ پہنچا تو حضرت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں، ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ وعدے کے مطابق اپنا آدمی نہ بھیجے، حضرت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس خطرہ کا ذکر اسلام قبول کرنے والوں کے سرداروں سے کیا، اور ارادہ کیا کہ یہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ قبیلہ ''بنو المصطلق'' کے لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ فلاں تاریخ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد آئے گا، اس لئے اس تاریخ کو یہ حضرات تعظیماً بستی سے باہر نکلے کہ قاصد کا استقبال کریں۔

حضرت ولید بن عقبہ کا واپس جانا

دوسری طرف یہ واقعہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقررہ تاریخ پر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا قاصد بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے

لئے بھیج دیا تھا، مگر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو راستے میں یہ خیال آیا کہ اس قبیلے کے لوگوں سے میری پرانی دشمنی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں۔ چونکہ وہ لوگ ان کے استقبال کے لئے بستی سے باہر بھی نکلے تھے، اس لئے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ یہ لوگ شاید پرانی دشمنی کی وجہ سے مجھے قتل کرنے آئے ہیں، چنانچہ آپ راستے ہی سے واپس ہو گئے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر کہا کہ ان لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے، اور میرے قتل کا ارادہ کیا، اس لئے میں واپس چلا آیا۔

تحقیق کرنے پر حقیقت واضح ہوئی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سن کر غصہ آیا، اور آپ نے مجاہدین کا ایک لشکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں روانہ کیا، ادھر سے مجاہدین کا لشکر روانہ ہوا، ادھر حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے روانہ ہوئے، جب آمنا سامنا ہوا تو حضرت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ آپ لوگ ہمارے اوپر کیوں چڑھائی کرنے آئے ہو، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری بات یہ ہوئی تھی کہ تم میں سے کوئی شخص زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے آئے گا۔ لشکر والوں نے جواب دیا کہ زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے ایک شخص آیا تھا، لیکن آپ لوگوں نے اس پر حملہ کرنے کے لئے لشکر اکٹھا کر لیا۔ بنو المصطلق کے لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس کوئی آدمی نہیں آیا، اور نہ ہم نے لشکر اکٹھا کیا، بلکہ ہم لوگ اس خیال میں تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ

وسلم کا قاصد آنے والا ہے، اس لئے ہم لوگ روزانہ استقبال کرنے کے ارادے سے باہر نکل کر جمع ہو جاتے تھے، تب حقیقت حال کھلی، اور پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واپس آکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سارا واقعہ سنایا کہ یہ غلط فہمی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے یہ سارا قصہ ہوا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

سنی سنائی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی غیر ذمہ دار آدمی کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے اس کی تحقیق کرو، تحقیق کے بغیر اس خبر کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہ کرو۔ اس واقعہ میں ساری غلط فہمی جو پیدا ہوئی، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی نے آکر بتادیا ہوگا کہ یہ لوگ تم سے لڑنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، اس لئے وہ راستے ہی سے واپس آگئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو یہ ہدایت دیدی کہ ایسا نہ ہو کہ جو بات کسی سے سن لی، بس اس پر یقین کرلیا، اور اس بات کو آگے چلتا کردیا، اور اس خبر کی بنیاد پر کوئی کارروائی شروع کردی، ایسا کرنا حرام ہے۔

افواہ پھیلانا حرام ہے

اس کو آج کل کی اصطلاح میں ''افواہ سازی'' کہتے ہیں، یعنی افواہیں پھیلانا، افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ برائی اس طرح پھیل گئی ہے کہ ''الامان والحفیظ'' کسی بات کو آگے نقل کرنے میں، بیان کرنے میں احتیاط اور تحقیق کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا، بس کوئی اُڑتی ہوئی بات کان میں پڑگئی،

اس کو فوراً آگے چلتا کر دیا، خاص طور پر اگر کسی سے مخالفت ہو، کسی سے دشمنی ہو، کسی سے سیاسی یا مذہبی مخالفت ہو، یا ذاتی مخالفت ہو تو اگر اس کے بارے میں ذراسی بھی کہیں سے کان میں کوئی بھنک پڑ جائے گی، تو اس پر یقین کر کے لوگوں کے اندر اس کو پھیلانا شروع کر دیں گے۔

آج کل کی سیاست

آج کل سیاست کے میدان میں جو گندگی ہے، اس گندی سیاست میں یہ صورت حال ہو رہی ہے کہ اگر سیاست میں ہمارا کوئی مد مقابل ہے تو اس کے بارے میں افواہ گھڑنا اور اس کو بغیر تحقیق کے آگے چلتا کر دینا، اس کا آج کل عام رواج ہو رہا ہے، مثلاً یہ کہ فلاں شخص نے اتنے لاکھ روپے لے کر اپنا ضمیر بیچا ہے، بغیر تحقیق کے الزام عائد کر دیا، یاد رکھئے! کوئی شخص کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، لیکن اس پر جھوٹا الزام عائد کرنے کا کوئی جواز نہیں، شرعاً ایسا کرنا حرام ہے۔

حجاج بن یوسف کی غیبت جائز نہیں

ایک مجلس میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تشریف فرما تھے، کسی شخص نے اس مجلس میں حجاج بن یوسف کی برائی شروع کر دی، حجاج بن یوسف ایک ظالم حکمران کے طور پر مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ اس نے سینکڑوں بڑے بڑے علماء کو قتل کیا۔ کسی شخص نے اس مجلس میں حجاج بن یوسف پر الزام عائد کیا کہ اس نے یہ کیا تھا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ سوچ سمجھ کر بات کرو، یہ مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم و جابر ہے تو اس کی غیبت کرنا حلال ہو گیا، یا اس پر بہتان باندھنا حلال ہو گیا، اگر اللہ تعالیٰ حجاج بن یوسف سے سینکڑوں انسانوں کے خون کا بدلہ لے گا جو اس کی گردن پر ہیں تو تم

سے بھی اس کا بدلہ لگا کہ تم نے اس کے بارے میں جھوٹی بات کہی، یہ مت سمجھنا کہ اگر وہ ظالم ہے تو جو چاہو اس کے بارے میں جھوٹ بولتے رہو، اس پر جو چاہو الزام تراشی کرتے رہو، تمہارے لئے یہ حلال نہیں۔

سنی ہوئی بات آگے پھیلانا جھوٹ میں داخل ہے

بہرحال! کسی بھی شخص کے بارے میں کوئی بات بغیر تحقیق کے کہہ دینا یہ اتنی بڑی بیماری ہے جس سے پورے معاشرے میں بگاڑ اور فساد پھیلتا ہے، دشمنیاں جنم لیتی ہیں، عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ جب بھی تمہیں کوئی خبر ملے تو پہلے اس خبر کی تحقیق کرلو، ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ

یعنی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سنے اس کو آگے بیان کرنا شروع کردے۔ لہٰذا جو آدمی ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بیان کرنے لگے تو وہ بھی جھوٹا ہے، اس کو جھوٹ بولنے کا گناہ ہوگا۔ جب تک تحقیق نہ کرلو، بات کو آگے بیان نہ کرو۔

پہلے تحقیق کرو، پھر زبان سے نکالو

افسوس یہ ہے کہ آج ہمارا معاشرہ اس گناہ کے اندر ڈوبا ہوا ہے، ایک شخص کی بات آگے نقل کرنے میں کوئی احتیاط نہیں، بلکہ اپنی طرف سے اس میں نمک مرچ لگا کے اضافہ کر کے اس کو آگے بڑھا دیا۔ دوسرے شخص نے جب سنا تو اس نے اپنی طرف سے اور اضافہ کر کے آگے چلتا کردیا، بات ذرا سی تھی، مگر وہ پھیلتے پھیلتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اس کے نتیجے میں دشمنیاں، عداوتیں، لڑائیاں،

قتل و غارت گری اور نفرتیں پھیل رہی ہیں۔ بہر حال! قرآن کریم ہمیں یہ سبق دے رہا ہے کہ یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے، یہ اس لئے نہیں دی کہ اس کے ذریعہ تم جھوٹی افواہیں پھیلاؤ، اس لئے نہیں دی کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں پر الزام اور بہتان عائد کیا کرو، بلکہ تمہارا فرض ہے کہ جب تک کسی بات کی مکمل تحقیق نہ ہو جائے، اس کو زبان سے نہ نکالو۔ افسوس ہے کہ آج ہم لوگ باری تعالیٰ کے اس حکم کو فراموش کئے ہوئے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ہم طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس برائی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

افواہوں پر کان نہ دھریں

انسان کے کانوں میں مختلف اوقات میں مختلف باتیں پڑتی رہتی ہیں، کسی نے آکر کوئی خبر دیدی، کسی نے کوئی خبر سنادی، کسی نے کچھ کہہ دیا، اگر آدمی ہر کی بات کو سچ سمجھ کر اس پر کاروائی کرنا شروع کردے تو سوائے فتنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا، چنانچہ ایک اور موقع پر ایسا ہوا تھا کہ منافقین مختلف قسم کی افواہیں پھیلاتے رہتے تھے، چنانچہ مسلمان سادہ لوحی میں ان کی باتوں کو سچ سمجھ کر کوئی کارروائی شروع کر دیتے تھے، اس پر قرآن کریم کی ایک اور آیت نازل ہوئی، جس میں فرمایا کہ:

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ (النساء: ۸۳)

یعنی منافقین کا کام یہ ہے کہ ذرا سی کوئی افواہ کان میں پڑی، چاہے وہ

حالت امن ہو، یا حالت جنگ ہو، بس فوراً اس کی نشر و اشاعت شروع کر دیتے ہیں، اور اپنی طرف سے اس میں نمک مرچ لگا کر اس کو روانہ کر دیتے ہیں، جس سے فتنہ پھیلتا ہے، مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب اس قسم کی کوئی خبر آپ تک پہنچے تو اس پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دوسرے ذمہ دار افراد کو بتاؤ کہ یہ خبر پھیل رہی ہے، اس میں کون سی بات سچ ہے، اور کون سی بات غلط ہے، اس کی تحقیق کریں، اور تحقیق کے بعد کوئی فیصلہ کریں، نہ یہ کہ خود سے اس پر کارروائی شروع کر دیں۔ یہ ایک عظیم ہدایت ہے جو قرآن کریم نے عطا فرمائی ہے۔

جس سے شکایت پہنچی ہو اس سے پوچھ لیں

افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس ہدایت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس کے نتیجے میں فتنے پھیلے ہوئے ہیں، لڑائیاں ہیں، جھگڑے ہیں، عداوتیں ہیں، بغض اور کینہ ہے، ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی ہے، اگر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ان سب کی بنیاد غلط افواہیں ہوتی ہیں، خاندان والوں میں یا ملنے جلنے والوں میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ تمہارے بارے میں فلاں شخص یہ کہہ رہا تھا، اب آپ نے اس کی بات سن کر یقین کر لیا کہ اچھا فلاں شخص نے میرے بارے میں یہ کہا ہے، اب اس کی بنیاد پر اس کی طرف سے دل میں دشمنی، بغض، کینہ پیدا ہو گیا کہ وہ تو میرے بارے میں یہ کہہ رہا تھا، حالانکہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اگر کسی بھائی کی طرف سے شکایت کی کوئی بات پہنچی ہے تو براہ راست اس سے جا کر پوچھ لے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں یہ بات فرمائی تھی، کیا یہ بات صحیح ہے یا غلط ہے؟ اب صحیح بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔

باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا

آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ لوگ ایک کی بات دوسرے تک پہنچانے میں بالکل احتیاط سے کام نہیں لیتے، اگر ذرا سی بات ہو تو اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، اپنی طرف سے اس کے اندر اضافہ اور مبالغہ کر دیتے ہیں، میں ایک مثال دیتا ہوں، ایک صاحب نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ ٹیپ ریکارڈر پر قرآن کریم کی تلاوت سننے سے ثواب ملتا ہے یا نہیں؟ میں نے جواب دیا: چونکہ قرآن کریم کے الفاظ پڑھے جا رہے ہیں تو انشاء اللہ، اللہ کی رحمت سے اس کو سننے سے بھی ثواب ملے گا، البتہ براہ راست پڑھنے اور سننے سے زیادہ ثواب ملے گا۔ اب اس شخص نے جا کر کسی اور کو بتایا ہوگا، دوسرے نے تیسرے کو بتایا ہوگا، تیسرے نے شخص نے چوتھے کو بتایا ہوگا، یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا، اس میں لکھا تھا کہ یہاں ہمارے محلہ میں ایک صاحب تقریر میں یہ بات کہہ رہے ہیں کہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ ٹیپ ریکارڈر پر تلاوت سننا ایسا ہے جیسے ٹیپ ریکارڈ پر گانا سننا۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ بات کیا تھی، اور ہوتے ہوتے کہاں تک پہنچی، اور پھر برملا تقریر کے اندر یہ بات میری طرف منسوب کر دی کہ میں نے ایسا کہا ہے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ میں نے یہ بات کہی ہے۔

تلی ہوئی بات زبان سے نکلے

بہر حال! لوگوں میں بات نقل کرنے میں احتیاط ختم ہو چکی ہے، جب کہ

مسلمان کا کام یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلے وہ ترازو میں تلی ہوئی ہو، نہ ایک لفظ زیادہ ہو، نہ ایک لفظ کم ہو، خاص طور پر اگر آپ دوسرے کی کوئی بات نقل کر رہے ہوں تو اس میں تو اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر آپ اس کے اندر اپنی طرف سے کوئی بات بڑھائیں گے تو دوسرے پر بہتان ہوگا، جس میں دوہرا گناہ ہے۔

حضرات محدثینؒ کی احتیاط

قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ جب تم نے سے کسی شخص سے کوئی بات سنی ہو، اور حالات ایسے ہیں کہ لوگ بات نقل کرنے میں احتیاط نہیں کر رہے ہیں تو ایسے حالات میں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، یہ نہ ہو کہ جو بات سنی اس کو آگے چلتا کر دیا۔ حضرات محدثینؒ جنہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث محفوظ کر کے ہم تک پہنچائی ہیں، انہوں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نقل کرنے میں اتنی احتیاط کی ہے کہ اگر ذرا سا بھی الفاظ میں فرق ہو جائے تو روایت نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ فرماتے تھے کہ اتنی بات ہمیں یاد ہے، اتنی بات ہمیں یاد نہیں، حالانکہ معنی ایک ہی ہیں، لیکن پھر بھی فرماتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ کہا تھا، یا یہ لفظ کہا تھا۔

ایک محدث کا واقعہ

آپ نے سنا ہوگا کہ محدثین جب کوئی حدیث روایت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "حَدَّثَنَا فُلَانٌ"، یعنی ہمیں فلاں نے یہ حدیث سنائی، ایک مرتبہ ایک محدث

جب حدیث بیان کر رہے تھے تو " حَدَّثَنَا فُلَانٌ" کے بجائے " ثَنَا فُلَانٌ" کہہ رہے تھے، لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ " ثَنَا فُلَانٌ" کا کوئی مطلب اور معنی نہیں ہے، آپ " حَدَّثَنَا فُلَانٌ" کیوں نہیں کہتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں جب استاد کے درس میں پہنچا تو اس وقت میں نے استاد کی زبان سے " ثَنَا فُلَانٌ" کا لفظ سنا تھا، شروع کا لفظ " حَدَّ" میں نہیں سن سکا تھا، اس لئے میں " ثَنَا فُلَانٌ" کے الفاظ سے حدیث سنا رہا ہوں۔ حالانکہ یہ بات بالکل یقینی تھی کہ استاد نے "حَدَّثَنَا" ہی کہا تھا، صرف "ثَنَا" نہیں کہا تھا، لیکن چونکہ اپنے کانوں سے صرف "ثَنَا" سنا تھا، "حَدَّ" کا لفظ نہیں سنا تھا، اس لئے جب روایت کرتے تو "حَدَّثَنَا" نہیں کہتے، تاکہ جھوٹ نہ ہو جائے، بس جتنا سنا، اتنا ہی آگے بیان کروں گا، اس احتیاط کے ساتھ حضرات محدثین نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ احادیث ہم تک پہنچائی ہیں۔

حدیث کے بارے میں ہمارا حال

آج ہمارا یہ حال ہے کہ نہ صرف عام باتوں میں بلکہ حدیث کی روایت میں بھی احتیاط نہیں کرتے، حدیث کے الفاظ کچھ تھے، لیکن لوگ یہ کہہ کر بیان کر دیتے ہیں کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا، حالانکہ اس حدیث کا کہیں سراغ نہیں ملتا، اور تحقیق کے بغیر آگے بیان کر دیتے ہیں۔

حکومت پر بہتان لگانا

آج سیاسی پارٹیوں میں اور مذہبی فرقہ واریوں میں یہ بات عام ہو گئی ہے کہ ایک دوسرے پر بہتان لگانے میں کوئی باک اور ڈر محسوس نہیں کرتے، بس ذرا

سی کوئی بات سنی اور آگے چلتی کردی۔ اگر حکومت سے ناراضگی ہے، اور حکومت کے خلاف چونکہ طبیعت میں اشتعال ہے، لہٰذا اس کے خلاف جو خبر آئے، اس کو آگے پھیلادو، اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں کہ وہ صحیح ہے، یا غلط ہے، یاد رکھیے! حکمرانوں کے اندر ہزاروں برائیاں موجود ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس پر بہتان لگانا شروع کردو۔ افسوس یہ ہے کہ یہی معاملہ آج حکومت عوام کے ساتھ کررہی ہے، حکومت کے ایک بڑے ذمہ دار حکمران، جو پورے ملک کے ذمہ دار ہیں، ان کو لوگوں پر بہتان لگانے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتی۔

دینی مدارس کے خلاف دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈا

آج پروپیگنڈا ایک مستقل فن اور ہنر بن چکا ہے، جرمنی کا ایک سیاسی فلسفی گزرا ہے، اس نے یہ فلسفہ پیش کیا تھا کہ جھوٹ کو اتنی شدت سے پھیلاؤ کہ دنیا اس کو سچ سمجھنے لگے، آج دنیا میں سارے پروپیگنڈے کا ہنر اس فلسفے کے گرد گھوم رہا ہے، جس پر جو چاہو بہتان لگا کر اس کے بارے میں پروپیگنڈا شروع کردو۔ آج دنیا میں یہ پروپیگنڈا شروع ہوگیا ہے کہ یہ دینی مدارس دہشت گرد ہیں، اور ان میں طلباء کو دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے، یہاں سے دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں، آج اس پروپیگنڈے کو تین سال ہوچکے ہیں، اور عوام نہیں، بلکہ حکومت کے ذمہ دار لوگ برملا یہ کہتے ہیں کہ مدارس کے اندر دہشت گردی ہورہی ہے۔ مدارس کے حضرات نے ان سے کئی مرتبہ کہا کہ خدا کے لئے مدارس کے اندر آکر دیکھو، تمہارے پاس ہتھیاروں کو پکڑنے کے حساس ترین آلات موجود ہیں، اور دہشت

گردی کے سراغ رسانی کے حساس ترین آلات موجود ہیں، وہ سب استعمال کر کے دیکھو کہ کسی مدرسے میں دہشت گردی کا سراغ ملتا ہے۔ اگر کسی مدرسے میں سراغ ملے تو ہماری طرف سے کھلی چھوٹ ہے کہ اس کے خلاف کاروائی کریں، اور ہم بھی تمہارے ساتھ اس کے خلاف کاروائی کرنے میں تعاون کریں گے۔ مگر یہ رٹ لگی ہوئی ہے کہ یہ مدارس دہشت گرد ہیں، اور پروپیگنڈے کی بنیاد پر سارے دینی مدارس کو جہاں اللہ اور اللہ کے رسول کے کلام کی تعلیم ہو رہی ہے، ان کو دہشت گرد قرار دیدینا، اور مغرب کے پروپیگنڈے کو آگے بڑھانا کہاں کا انصاف اور کہاں کی دیانت ہے۔

دینی مدارس کا معائنہ کرلو

تعلیمی اداروں میں بھی جرائم پیشہ لوگ گھس آتے ہیں، کیا یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جرائم پیشہ لوگ نہیں ہوتے؟ ایسی صورت میں ان جرائم پیشہ افراد کے خلاف کاروائی کی جاتی ہے، یہ تو نہیں کہا جاتا کہ ساری یونیورسٹیاں دہشت گرد ہیں، اور سارے کالجز جرائم پیشہ ہیں۔ لیکن چونکہ مغرب کی طرف سے یہ پروپیگنڈا اس اصول کی بنیاد پر ہو رہا ہے کہ جھوٹ اس شدت سے پھیلاؤ کہ دنیا اس کو سچ جاننے لگے، آج دینی مدارس اور دہشت گردی کو اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مرادف ہو گئے۔ قرآن کریم کا کہنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفیت میں کسی قوم کو خواہ مخواہ نقصان پہنچا دو، بعد میں تمہیں شرمندہ ہونا پڑے، اس لئے پہلے تحقیق کرلو، تحقیق کرنے کے تمام آلات اور وسائل تمہیں مہیا ہیں، آ کر

دیکھ لو۔ اور دینی مدارس پر الزام لگانے والے وہ ہیں جنہوں نے آج تک دینی مدارس کی شکل نہیں دیکھی، آکر دیکھا نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، وہاں کیا پڑھایا جا رہا ہے؟ کس طرح تعلیم دی جارہی ہے، لیکن مدارس کے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے، اور جو بند ہونے کا نام نہیں لیتا۔

غلط مفروضے قائم کر کے بہتان لگانا

لندن والوں نے کہہ دیا کہ یہاں جو دھماکے ہوئے ہیں، اس میں ایسا شخص ملوث ہے، جس نے یہاں کے مدارس میں کچھ دن قیام کیا تھا۔ ارے بھائی وہ شخص وہیں پلا بڑھا، اور وہیں پر برطانیہ میں کسی دینی مدرسے میں نہیں بلکہ برطانیہ کے موڈرن تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کی، اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ چند روز کے لئے پاکستان آیا تھا، تو کیا پاکستان آنے سے یہ لازم ہو گیا کہ اس نے ضرور دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہوگی، اور اس نے یہاں ضرور دہشت گردی کی تربیت پائی ہوگی۔ اس بنیاد پر یہ مفروضے قائم کر لینا، اور اس بنیاد پر یہ نادر شاہی حکم نافذ ہو گیا کہ جتنے غیر ملکی طلباء دینی مدارس میں پڑھتے ہیں، ان کو ملک سے رخصت کر دیا جائے۔

پہلے خبر کی تحقیق کر لو

میرے بھائیو! یہ ہمارے معاشرے کا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ عوام ہو، یا حکومت ہو، سیاسی جماعتیں ہوں، یا مذہبی فرقہ واریت ہو، سب اس میں مبتلا ہیں کہ ذرا افواہ کی کوئی بات کان میں پڑی، اس پر نہ صرف یہ کہ یقین کر لیا، بلکہ اس کو آگے پھیلایا، اور اس کی بنیاد پر کارروائی شروع کر دی، اور اس کے نتیجے میں ظلم وستم کی

انتہا کردی گئی۔ جبکہ قرآن کریم نے اس آیت میں یہ پیغام دیا ہے کہ اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر ذمہ دار شخص کوئی خبر لے کر آتا ہے تو پہلے اس کی تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفیت سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچادو، بعد میں تم لوگوں کو ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑے۔ اگر ہم قرآن کریم کے اس حکم کو پلے باندھ لیں، اور زندگی کے ہر گوشے میں اس کو استعمال کریں تو یقیناً ہمارے معاشرے کے نوے فیصد جھگڑے ختم ہوجائیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں قرآن کریم کی اس ہدایت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

زبان کو صحیح استعمال کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر: ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان کو صحیح استعمال کریں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○ (سورۃ الحجرات:٦)

تمہید

بزرگان محترم و برادران عزیز! سورۃ الحجرات کی تفسیر کا بیان کچھ عرصہ سے چل رہا ہے، کیونکہ یہ سورۃ مسلمانوں کے لئے بڑے اہم احکام پر مشتمل ہے، اور ہمارے درمیان جو معاشرتی خرابیاں پائی جاتی ہیں، ان خرابیوں کو دور کرنے کے

لئے اس سورۃ میں دی گئی ہدایات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس سورۃ کی ایک آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی جس کا بیان دو جمعوں سے چل رہا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے، فاسق کے معنی ہیں ''گناہ گار'' کے، اس سے ہر غیر ذمہ دار آدمی مراد ہے، بہرحال! اگر کوئی گناہ گار یا غیر ذمہ دار آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم ہوشیار ہو جاؤ، اور پہلے اس خبر کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ اس خبر پر بھروسہ کر کے تم کچھ لوگوں کے خلاف کارروائی کر ڈالو، اور بعد میں تمہیں اس پر ندامت اور شرمندگی ہو۔

ذمہ دار انسان کا رویہ اختیار کرو

جس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، اس کی تفصیل گزشتہ جمعہ کو عرض کر چکا ہوں، اس آیت میں ایک عظیم ہدایت یہ ہے کہ مسلمان کا رویہ بڑے ذمہ دار انسان کا رویہ ہونا چاہیے، یہ نہ ہو کہ جو بات کان میں پڑی، اس پر بھروسہ کر لیا، اور اس کو آگے سنانا شروع کر دیا، اور اس کی بنیاد پر کسی کے خلاف کارروائی شروع کر دی، یا اس کی بنیاد پر کسی کے خلاف دل میں بدگمانی پیدا کر لی، یہ سب ناجائز ہیں، اور ایک مسلمان کا شیوہ نہیں ہے، جب تک کسی معاملے کی پوری تحقیق نہ ہو جائے، اور یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ واقعہ سچا ہے، اس وقت تک اس پر نہ تو بھروسہ کرو، اور نہ وہ خبر دوسروں کو سناؤ، اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی کارروائی کرو۔

زبان عظیم نعمت ہے

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ جو زبان عطا فرمائی ہے، یہ اتنی بڑی اور عظیم نعمت ہے کہ ہم جب چاہیں، اور جو بات چاہیں، اپنی زبان سے نکال کر اپنے دل کی خواہش

دوسرے تک پہنچا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایسا خودکار نظام بنادیا ہے کہ ادھر دل میں ایک خیال آیا، اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کا ارادہ ہوا، ادھر دماغ سے لے کر زبان تک تمام سرکاری مشینیں حرکت میں آگئیں، اور اسی لمحے آپ نے وہ بات دوسروں تک پہنچادی۔ اگر یہ کہا جاتا کہ جب تم کوئی بات دوسرے تک پہنچانا چاہتے ہو تو پہلے ایک سوئچ آن کرو، اور پھر نمبر ملاؤ، اور پھر دوسرے تک بات پہنچاؤ، جیسے ٹیلی فون میں کرنا پڑتا ہے، بتایئے! اس وقت کتنی مصیبت ہوتی کہ آدمی فوراً ایک بات دوسرے سے کہنا چاہتا ہے، اور وہ دوسرا شخص سامنے موجود ہے، لیکن فوراً وہ بات اس تک نہیں پہنچا سکتے، بلکہ پہلے سوئچ آن کرنا پڑے گا، پھر نمبر ملانا پڑے گا، پھر بات پہنچا سکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کاموں کی تکلیف نہیں دی، بلکہ ادھر دل میں ایک خیال آیا، ادھر آپ نے زبان سے اس کو ادا کردیا، اور دوسروں کو اپنا خیال سنا دیا۔

زبان کی قدر بے زبان سے پوچھیے

میں نے اپنی زندگی میں دو آدمی ایسے دیکھے کہ ان کا حال یہ تھا کہ ان کے گلے کا بانسہ جس سے آواز نکلتی ہے، وہ خراب ہوگیا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ زبان تو حرکت کرتی تھی، لیکن آواز نہیں نکلتی تھی، ڈاکٹروں کے پاس گئے تو انہوں نے ایک آلہ تجویز کیا، اب جب بات کرنی ہوتی تو اس آلہ کو وہ گلے پر لگاتا، پھر آواز نکلتی، لیکن وہ آواز ایسی نکلتی جیسے کوئی جانور بول رہا ہے، اور بچے وہ آواز سن کر ہنستے تھے۔ میں اس شخص کی بے چینی دیکھتا کہ جب اس کو بات کہنی ہوتی تو پہلے وہ آلہ تلاش کرتا، پھر اس کو لگاتا، اور گلے کو زور سے دباتا، تب جاکر بمشکل آواز نکلتی۔ دیکھ کر عبرت ہوئی کہ یہ بھی ایک انسان ہے، اس کا بھی یہ دل چاہتا ہے کہ میں اپنے دل کی بات

جلدی سے دوسروں تک پہنچادوں، لیکن اس کو اس پر قدرت نہیں۔ اللہ جل شانہ نے اپنے فضل و کرم سے زبان کی یہ نعمت ہمیں عطا فرمائی ہوئی ہے کہ ادھر دل میں خیال آیا، ادھر دوسرے تک پہنچا دیا، درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہے۔

تمام مشینیں حرکت کر رہی ہیں

پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں کہ جب آدمی بات کرنا چاہتا ہے تو پہلے دل میں اس بات کا خیال آتا ہے، پھر وہ خیال دماغ میں جاتا ہے، اور پھر دماغ کی طرف سے زبان کے لئے حکم جاری ہوتا ہے، پھر زبان بولتی ہے۔ دیکھئے! ایک طرف دل ہے جو سوچ رہا ہے، دوسری طرف دماغ ہے، جو حکم جاری کر رہا ہے، اور تیسری طرف زبان ہے، جو حرکت کر رہی ہے، اور پھر گلے کا پورا نظام کام کر رہا ہے، جس کے نتیجے میں آواز باہر نکل رہی ہے، یہ مشینریاں صرف اس لئے حرکت میں ہیں تا کہ ہم اپنی بات دوسروں تک پہنچا دیں، یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بے مانگے مفت میں ہمیں عطا کر رکھی ہے۔

سوچ کو زبان کو استعمال کرو

اللہ تعالیٰ کا صرف ایک مطالبہ ہے، وہ یہ کہ یہ سرکاری مشینیں جو تمہیں دیدی گئی ہیں، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اور مرتے دم تک یہ مشینیں کام کر رہی ہیں، کبھی اس مشین کو ورکشاپ بھیجنا نہیں پڑتا، کبھی ان کی اوور ہالنگ نہیں کرانی پڑتی، کبھی ان کی سروس نہیں کرانی پڑتی، جو مشینیں مسلسل تمہارے ساتھ ہیں، ہمارا صرف ایک مطالبہ ہے، وہ یہ کہ جب تم اس زبان کو استعمال کرو تو سوچ سمجھ کر کرو کہ اس سے کیا نکال رہے ہو، یہ نہ ہو کہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے، جو منہ میں آ رہا ہے وہ زبان سے نکال رہے ہو، یہ دیکھے بغیر کہ اس سے فائدہ پہنچے گا، یا نقصان پہنچے گا،

صحیح بات کہہ رہا ہوں، یا غلط بات کہہ رہا ہوں، یہ بات اللہ کو راضی کرنے والی ہے، یا ناراض کرنے والی ہے۔ اس سرکاری مشین سے فائدہ اٹھاؤ، لیکن ذرا سوچ کر فائدہ اٹھاؤ۔

ایک ایک لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے

قرآن کریم نے فرمادیا کہ:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق:)

انسان جو کلمہ بھی اور جو لفظ بھی زبان سے نکال رہا ہے، اس کو محفوظ کرنے والا اللہ تعالیٰ مقرر کر دیا ہے، جو ریکارڈ کر رہا ہے، آج سے پہلے تو ریکارڈ کرنے کا تصور کرنے میں دشواری ہوتی تھی کہ ایک ایک لفظ کس طرح ریکارڈ ہو رہا ہے، لیکن آج کل ٹیپ ریکارڈر اور دوسرے جدید آلات نے اس کا تصور آسان کر دیا ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ جو لفظ بھی زبان سے نکالا وہ ریکارڈ ہو گیا، چاہے وہ اچھی بات ہو، یا بری بات ہو، اسی طرح ہر ہر لفظ اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہو رہا ہے، روز پیدائش سے لے کر آج تک کے، اور مرنے تک تمام الفاظ ریکارڈ کرنے کا سسٹم اللہ تعالیٰ کے یہاں موجود ہے، اور جب ہم اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچیں گے تو وہاں پر وہ ریکارڈنگ سنادی جائے گی کہ تم نے فلاں وقت میں فلاں بات کہی تھی، آج اس بات کا ثبوت پیش کرو جو تم نے کہی تھی، یہ بات تم نے صحیح کہی تھی، یا غلط کہی تھی، اور تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟

اس وقت کیوں محتاط گفتگو کرو گے؟

آج اگر لوگ ایک جگہ پر بیٹھے ہوں، اور یہ پتہ ہو کہ سی. آئی. ڈی کی طرف سے یہاں پر ایک ٹیپ ریکارڈر لگا ہوا ہے، اور جو شخص بھی جو بات کہے گا وہ ریکارڈ

ہو جائے گی، بتاؤ! کیا اس وقت بھی اتنی آزادی سے بولو گے؟ جیسے آج بولتے ہو، یا اس وقت بھی اسی طرح بے محابہ جو منہ میں آئے گا، بک جاؤ گے؟ نہیں، ایسا نہیں کرو گے، اس لئے کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں سی. آئی. ڈی نے ٹیپ ریکارڈ رلگایا ہوا ہے، اور ایک ایک کلمہ ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کے نتیجے میں اگر یہ بات حکام بالا تک پہنچ گئی تو میں پکڑا جاؤں گا، اس لئے اس مجلس میں ہر شخص محتاط ہو کر گفتگو کرے گا۔

ذمہ دار بننے کی فکر کریں

اللہ تعالیٰ نے تو چودہ سو سال پہلے سے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ تمہاری ایک ایک بات اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہو رہی ہے، لہٰذا جب بھی بولو تو سوچ سمجھ کر بولو کہ بات صحیح کہہ رہے ہو، یا غلط کہہ رہے ہو، ویسے افواہیں پھیلا رہے ہو، غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر رہے ہو، لوگوں پر الزام لگا رہے ہو، لوگوں کی غیبتیں کر رہے ہو، لوگوں کی دل آزاریاں کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں سب باتوں کا جواب دینا ہوگا۔ یہ مت سمجھنا کہ بات زبان سے نکلی اور ہوا میں اڑ گئی، اور ختم ہو گئی، کوئی بات ختم نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ ہے۔ اس لئے قرآن کریم جو ہمارے لئے پیغام ہدایت ہے، وہ ہمیں ذمہ دار بننے کی تلقین کر رہا ہے، یہ نہ ہو کہ جو بات سنی وہ آگے چلتی کر دی۔

جھوٹ کی بدترین سواری

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان جائیے کہ آپ نے احادیث میں اس کی جو تشریحات فرمائی ہیں، اس میں ہمارے لئے مزید تنبیہ کا سامان ہے، انسان کی نفسیات سے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون باخبر ہو سکتا

ہے، ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بِئْسَ مَطِيَّةُ الْكَذِبِ زَعَمُوْا (او کما قال)

یعنی جھوٹ کی بدترین سواری یہ ہے کہ لوگ یہ کہتے ہیں، لوگوں کا خیال یہ ہے۔ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوٹا سا جملہ ہے، لیکن اس نے انسان کی ایک عظیم کمزوری کی نشاندھی کی ہے، وہ یہ کہ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں، جن کو جھوٹ بولنے میں کوئی باک نہیں ہوتا، غلط بات کہنے میں کوئی باک نہیں ہوتا، ایسے لوگ تو مجرم ہیں ہی، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ میں جھوٹا نہ کہلاؤں، لوگ مجھے جھوٹا نہ کہیں، اگر کہیں جھوٹا ثابت ہوگیا تو پشیمانی اور ندامت ہوگی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں نے جھوٹ بولنے کے لئے ایک حیلہ نکالا ہے، وہ حیلہ یہ ہے کہ براہ راست جھوٹ بولنے کے بجائے یوں کہہ دیا جائے کہ لوگ ایسا کہتے ہیں، لوگوں کا یہ خیال ہے فلاں آدمی اتنے روپے لے کر کھا گیا، بظاہر کہنے والے نے اپنے سر سے ذمہ داری ٹال دی، اور لوگوں پر ڈال دی کہ لوگ کہتے ہیں، لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر ذمہ داری ڈال کر یہ بات لوگوں کے اندر پھیلا دوں۔ اب دو حال سے خالی نہیں، یا تو تم لوگوں کو جھوٹا سمجھتے ہو، یا سچا سمجھتے ہو، اگر لوگوں کو جھوٹا سمجھتے ہو تو پھر لوگوں کی بات کو آگے نقل کرنے تکلیف کیوں گوارا کر رہے ہو؟ اگر سچ سمجھتے ہو تو بتاؤ! تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل ہے یا نہیں؟ اگر تمہارے پاس ثبوت نہیں ہے، اور تم اس کو پوری طرح سچ نہیں سمجھتے، تو پھر جس طرح براہ راست اس بات کو آگے نقل کرنا جرم اور گناہ ہے، اور جھوٹ کے زمرے میں داخل ہے، اسی طرح اگر لوگوں کے سر پر رکھ کر اس بات کو بیان کرو گے تو وہ بھی درحقیقت جرم اور گناہ ہوگا۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹ کی بڑی خراب سواری یہ جملہ ہے کہ ''لوگ یہ کہتے ہیں''

لڑائیاں کیوں جنم لے رہی ہیں؟

یہ سب باتیں ذہن میں رکھ کر اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑا کر دیکھئے کہ آج ہمارے معاشرے میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں؟ کس طرح بے بنیاد باتوں پر بھروسہ کر کے اسے آگے چلتا کیا جا رہا ہے؟ اور کس طرح بے بنیاد باتوں کی بناء پر بدگمانیاں دل میں پیدا کی جا رہی ہیں؟ آگے اسی سورۃ میں یہ بیان بھی آنے والا ہے کہ یہ بدگمانی بھی حرام ہے، اور بے بنیاد خبروں کی بنیاد پر بدگمانی دل میں پیدا کر کے اس کے خلاف کاروائی کی جا رہی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں ان احکام کی خلاف ورزی قدم قدم پر نظر آئے گی، اور یہی چیزیں ہیں جنہوں نے معاشرے کو فساد اور بگاڑ میں مبتلا کیا ہوا ہے، عداوتوں کی آگ بھڑک رہی ہے، دشمنیاں، بغض اور کینہ پیدا ہو رہا ہے، اختلافات اور جھگڑے ہو رہے ہیں، ان سب کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔

سارے جھگڑے ختم ہو جائیں

اگر آج ہم قرآن کریم کی اس ہدایت کو پلے باندھ لیں، اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کو پلے باندھ لیں تو نہ جانے کتنے جھگڑے، کتنے قصے اور کتنے اختلافات اپنی موت مر جائیں، سارے جھگڑے اس لئے پیدا ہو رہے ہیں کہ ہم ان بے بنیاد باتوں پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے ہمیں ان ہدایات کو سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے، اور ان پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اللہ کا حکم بے چون و چرا تسلیم کرلو

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا حکم بے چون وچرا تسلیم کرلو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝ وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ط لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ (سورۃ الحجرات:۸،۷)

تمہید

بزرگان محترم و برادران عزیز! سورۃ الحجرات کی تفسیر کا بیان چل رہا ہے، گذشتہ دو تین جمعوں میں آیت نمبر چھ کی تفسیر آپ کے سامنے پیش کی تھی، جس میں باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کوئی فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو تمہارا فرض ہے

کہ پہلے اس کی تحقیق کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس غلط خبر کی بنیاد پر کسی شخص کو نقصان پہنچادو، اور بعد میں تمہیں پشیمانی اور ندامت ہو۔ اس کا بقدر ضرورت بیان الحمد للہ پچھلے دو تین جمعوں میں ہو چکا۔

تمہاری رائے کا حضور ﷺ کی رائے سے مختلف ہونا

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم بات کی طرف صحابہ کرام کو متوجہ فرمایا ہے، اور صحابہ کرام کے واسطے سے پوری امت مسلمہ کو متوجہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات یاد رکھو! کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود اور تشریف فرما ہیں، اگر وہ تمہارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت سی باتوں میں تمہاری اطاعت کرنے لگیں، یعنی جیسا تم کہو، ویسا ہی وہ کرلیں تو تم سخت مصیبت میں مبتلا اور پریشان ہو جاؤ گے۔ اس کے ذریعہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ بعض اوقات ایسے واقعات پیش آسکتے ہیں جن میں تمہاری ذاتی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے مختلف ہوگی، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات کا حکم دے رہے ہوں، اور تمہاری سمجھ میں وہ بات نہ آرہی ہو، یا ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل میں ایک تقاضا پیدا ہوا کہ یہ معاملہ یوں ہونا چاہیے، اور تم نے اپنی وہ رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہاری وہ رائے نہیں مانی، اور فرمایا کہ میں تمہاری رائے پر عمل نہیں کرتا، تو ایسی صورت میں یہ خیال دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرما رہے ہیں، یا آپ جس بات کا حکم دے رہے ہیں، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

خبر کی تحقیق کر لینی چاہیے

جیسا کہ وہ واقعہ جو میں نے گذشتہ آیت کی تفسیر میں عرض کیا تھا کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے قبیلہ بنو المصطلق کی طرف بھیجا، اور وہ صحابی غلط فہمی میں یہ سمجھ کر واپس آگئے کہ جن لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے جارہا ہوں، وہ میرے دشمن ہیں، اور وہ مجھے قتل کرنے کے لئے آبادی سے باہر نکلے ہیں۔ اور انہوں نے واپس آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بتادی تو اس وقت صحابہ کرام کو بہت جوش آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نمائندہ جس کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا گیا، اور ان لوگوں نے خود بلایا کہ ہمارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے ایک آدمی بھیج دیں، پھر وہ لوگ ایسی غداری کریں کہ اس قاصد کو قتل کرنے کے لئے آبادی سے باہر آجائیں، اس وقت صحابہ کرام کو بہت غصہ آیا، اور بہت صدمہ پہنچا، اور جوش خروش کے عالم میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ اب یہ لوگ اس لائق نہیں کہ ان کے ساتھ نرمی برتی جائے، آپ فوراً ان پر چڑھائی کا حکم دیں، اور ان پر حملہ کرکے ان سے جنگ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے ہمیں اس خبر کی تحقیق کرنی چاہیے، اس کے بعد کوئی اقدام کرنا چاہیے، چنانچہ آپ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معاملے کی تحقیق کے لئے بھیجا۔

تحقیق کے نتیجے میں بات واضح ہوگئی

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں سے بعض کے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ یہ تو بالکل واضح بات ہے کہ انہوں نے غداری کی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے کی توہین کی ہے، لہٰذا اس بارے میں زیادہ تحقیق اور غور و فکر کی

ضرورت نہیں تھی، براہ راست ان پر حملہ کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی بات نہیں مانی، اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہلے تحقیق کے لئے بھیجا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری بات مان لیتے، اور فوراً حملہ کر دیتے تو بے گناہ لوگ قتل ہو جاتے، کیونکہ حقیقت میں وہ لوگ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کرنے کے ارادے سے شہر سے باہر نہیں نکلے تھے، بلکہ وہ تو ان کے استقبال کے لئے باہر نکلے تھے، وہ تو کسی نے آکر غلط خبر دیدی تھی کہ ان کے قتل کے ارادے سے نکلے ہیں۔

رسول براہ راست اللہ کی ہدایت پر چلتے ہیں

اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری ہر بات کو مانا کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں ہی نقصان پہنچے گا، اور تم خود ہی مشکل میں پڑ جاؤ گے، اور مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اس کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک رسول بھیجا ہے، وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جن کا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے، جن پر صبح و شام وحی نازل ہو رہی ہے، جنہیں وہ باتیں بتائی جا رہی ہیں جو تمہارے علم میں نہیں ہیں، وہ احکام دیے جا رہے ہیں جو بسا اوقات تمہاری سمجھ میں نہیں آتے، اگر وہ تمہارے پیچھے چلنے لگیں، اور جیسا تم کہو، ویسا ہی وہ کرنے لگیں تو پھر رسول بھیجنے کا منشا ہی فوت ہو گیا، پھر رسول بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ رسول تو بھیجا ہی اس لئے جا رہا ہے تاکہ وہ ان باتوں کے بارے میں تمہیں بتائیں جو بسا اوقات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم، یا آپ کا کوئی اقدام، یا آپ کا کوئی عمل تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو تم اس پر اعتراض کرنے بیٹھ جاؤ، یا تمہارے دل میں اس پر شبہات

پیدا ہونے لگیں۔ ارے رسول تو اسی لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو بتائے جو تم خود اپنی سمجھ سے اور اپنی عقل سے سمجھ نہیں سکتے۔

عقل ایک حد تک صحیح فیصلہ کرتی ہے

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے، اور یہ عقل اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اگر انسان اس کو صحیح استعمال کرے تو اس سے دنیا و آخرت کے بہت سے فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ یہ عقل جو تمہیں دی گئی ہے، یہ ساری کائنات کی تمام حکمتوں کا احاطہ کرسکتی ہے، یہ عقل بڑی کام کی چیز ہے، لیکن اس کی بھی کچھ حدود ہیں، یہ لامحدود نہیں، ایک حد تک یہ کام کرتی ہے، اس حد سے آگے یہ کام کرنا بند کردیتی ہے۔ جیسے آنکھ ہے، یہ بڑے اعلیٰ درجے کی نعمت ہے، لیکن ایک حد تک دیکھے گی، جہاں تک نظر آئے گا، اس سے آگے نہیں دیکھے گی۔ اسی طرح عقل کی بھی ایک حد ہے، اس حد تک وہ کام کرتی ہے، اس حد سے آگے وہ کام نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور پیغمبر کو ان باتوں کی تعلیم کے لئے بھیجا ہے، جہاں انسان کی عقل کام نہیں کرسکتی، جہاں انسان کی عقل دھوکہ کھاسکتی ہے، ٹھوکر کھاسکتی ہے، اس موقع پر اللہ کا رسول ہی بتاتا ہے کہ وہ بات صحیح نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، صحیح بات وہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی کے ذریعہ بتائی۔

رسول کا حکم مانو، چاہے عقل میں آئے یا نہ آئے

جب یہ بات ہے تو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات بتائے، یا کسی بات کا حکم دے، اور تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا؟ اس حکم کی حکمت اور مصلحت سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو ایسی صورت میں اگر تم اپنی عقل کے پیچھے چلو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے رسول کو رسول ماننے سے انکار کردیا، رسول تو

بھیجا ہی اس لئے گیا تھا کہ جہاں تمہاری عقل کام نہیں کر رہی تھی، وہاں پر رسول وحی کی رہنمائی سے تمہیں بہرہ ور کرے۔ اس سے ہمیں یہ ہدایت ملی کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کسی بات کا حکم دیدیں، چاہے قرآن کریم کے ذریعہ حکم دیں، یا حدیث کے ذریعہ حکم دیں کہ فلاں کام کرو، یا فلاں کام نہ کرو، تو اب چاہے وہ حکم تمہاری سمجھ میں آرہا ہو، یا نہ آرہا ہو، اس حکم کی علت، اور اس کی حکمت، اور فائدہ تمہاری سمجھ میں نہ آرہا ہو، پھر بھی تمہارے ذمہ لازم ہے کہ اس پر عمل کرو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب: ۳۶)

یعنی اللہ اور اللہ کا رسول جب کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مؤمن مرد یا عورت کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار نہیں رہتا۔ اگر مؤمن ہے تو پھر اس حکم کو ماننا ہی ہوگا، اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ میری عقل ناقص ہے، اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت کامل ہے، لہٰذا مجھے اس کے آگے سر جھکانا ہے۔

”حکمت“ اور ”فائدے“ کا سوال

آج ہمارے دور میں یہ ذہنیت بہت کثرت سے پھیلتی جارہی ہے کہ جب لوگوں کو شریعت کا کوئی حکم بتایا جائے کہ فلاں چیز حرام ہے، قرآن کریم نے اس کو منع کیا ہے، یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع کیا ہے تو لوگ فوراً یہ سوال کرتے ہیں کہ کیوں منع کیا ہے؟ اس منع کرنے میں کیا حکمت اور کیا فائدہ ہے؟ گویا کہ وہ زبان حال سے یہ کہتے ہیں کہ جب تک ہماری سمجھ میں اس کا فلسفہ نہیں آئے گا، اور اس کی حکمت اور فائدہ ہماری عقل میں نہیں آئے گا، اس وقت تک ہم اس حکم پر عمل نہیں کریں گے۔ العیاذ باللہ العظیم۔ یہ ذہنیت عام ہو چکی ہے، خاص طور پر وہ

لوگ جو ذرا پڑھ لکھ گئے، تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لی تو اب شریعت کے ہر حکم کے بارے یہ سوال کرتے ہیں یہ کیوں ہے؟ اس میں کیا حکمت ہے؟ اور جب حکمت معلوم نہیں ہوتی اس وقت تک ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

ایسا "نوکر" ملازمت سے نکال دینے کے قابل ہے

حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے آگے "کیوں" کا سوال کرنا انتہاء درجے کی بے عقلی کی بات ہے، اس لئے کہ ہم تو اللہ کے بندے ہیں، اور "بندہ" بہت ادنیٰ درجہ کی چیز ہوتی ہے۔ دیکھئے! ایک ہوتا ہے "غلام" اور ایک ہوتا ہے "نوکر"۔ ان میں ترتیب اس طرح ہے کہ سب سے اعلیٰ "نوکر" دوسرے درجہ میں "غلام" اور تیسرے درجہ میں "بندہ"۔ اگر کسی نے کسی کو نوکر رکھا ہے تو وہ خاص کاموں کے لئے اور خاص اوقات کے لئے ہوتا ہے، وہ نوکر چوبیس گھنٹے کا غلام نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرے گا، اور متعین کام کرے گا، اب اگر آپ نے نوکر سے کہا کہ آج بازار سے دس کلو گوشت لے آؤ، اب وہ نوکر آپ سے یہ سوال کرے کہ دس کلو گوشت کیوں لاؤں؟ آپ کے گھر میں دو افراد ہیں، ایک کلو گوشت بھی بہت ہوتا ہے، پہلے یہ بتائیں کہ یہ دس کلو گوشت کیوں منگوا رہے ہیں؟ پھر میں لاؤں گا۔ بتایئے! کیا وہ نوکر اس لائق ہے کہ اس کو گھر میں رکھا جائے؟ یا اس لائق ہے کہ کان سے پکڑ کر اس کو باہر نکال دیا جائے؟ ارے بھائی تیرا یہ کام نہیں کہ تو ہم سے پوچھے کہ کیوں یہ چیز منگوا رہے ہو؟ تیرے کو اس لئے رکھا ہے کہ جب ضرورت ہوگی تو باہر سے سودا منگوایا کریں گے، تم اگر کیوں کا سوال کرتے ہو تم نوکر رہنے کے لائق نہیں۔ حالانکہ وہ تمہارا نوکر ہے، تمہارا غلام نہیں ہے، تمہارا بندہ نہیں ہے، آپ بھی مخلوق ہیں، وہ بھی مخلوق ہے، آپ بھی

انسان ہیں، وہ بھی انسان ہے، آپ کے اندر بھی اتنی عقل ہے، جتنی عقل اس کے اندر ہے، اس کے باوجود آپ اس کے "کیوں" کا سوال گوارا نہیں کرتے۔

ہم اللہ کے "بندے" ہیں

جبکہ آپ تو اللہ کے "بندے" ہیں، نوکر نہیں ہیں، غلام نہیں ہیں، اللہ نے آپ کو پیدا کیا ہے، اللہ آپ کا خالق ہے، آپ اس کی مخلوق ہیں، اور آپ کی عقل اور اس کی حکمت میں کوئی مناسبت ہی نہیں، آپ کی عقل محدود ہے، اس کی حکمت اور سمجھ لامحدود ہے، جب وہ خالق و مالک یہ کہتا ہے کہ فلاں کام کرو، آپ کہتے ہیں کہ میں یہ کام کیوں کروں؟ جب آپ اپنے نوکر سے یہ برداشت نہیں کرتے کہ وہ آپ سے "کیوں" کا سوال کرے تو اللہ تبارک تعالیٰ سے "کیوں" کا سوال کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم اپنے خالق سے، اپنے مالک سے، اپنے آقا سے، اپنے پیدا کرنے والے سے یہ پوچھ رہے ہو کہ وہ یہ حکم کیوں دے رہے ہیں؟ یہ انتہاء درجے کی بے غیرتی کی بات ہے، انتہاء درجے کی بے شرمی کی بات ہے کہ اللہ اور اس رسول کے حکم پر "کیوں" کا سوال کیا جائے۔

"کیوں" کا سوال بے عقلی کی دلیل ہے

یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن ضروری نہیں کہ وہ حکمت تمہاری سمجھ میں بھی آجائے۔ لہٰذا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے آگے سر جھکائے بغیر انسان مؤمن نہیں ہوسکتا، اگر وہ "کیوں" کا سوال کرتا ہے تو وہ درحقیقت بے عقلی کا سوال ہے، اگر ہر بات تمہاری عقل میں آجایا کرتی، اور اپنے ہر اچھے برے کو تم پہچان سکتے تو اللہ تعالیٰ کو نہ پیغمبر بھیجنے کی ضرورت تھی، نہ آسمان سے کوئی کتاب نازل کرنے کی ضرورت تھی، اور نہ دنیا میں وحی کا سلسلہ

قائم کرنے کی ضرورت تھی، یہ سب اس لئے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تمہاری عقل چھوٹی سی ہے، اور بہت محدود ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک کی عقل کچھ کہہ رہی ہے، اور دوسرے کی عقل کچھ کہہ رہی ہے، ایک کی عقل میں ایک بات آرہی ہے، دوسرے کی عقل میں نہیں آرہی، یہ سب عقل کے محدود ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنا حکم اسی جگہ بھیجتا ہے جہاں عقل کی پرواز رُک جاتی ہے۔ اس لئے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ نہ تو یہ ہونا چاہیے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بارے میں یہ سوال کرو کہ یہ کیوں دیا جارہا ہے؟ اور یہ حکم ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، اور اس کے نتیجے میں اس حکم کو چھوڑ بیٹھو، اور نہ یہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ تمہاری سمجھ میں آرہا ہے، اللہ کا رسول اس کو مانتا رہے کہ جو تم کہہ رہے ہو، وہ درست ہے۔

آج کل کے لیڈروں کا حال

آج کل کے لیڈروں کا معاملہ الٹا ہو گیا ہے، "لیڈر" اور "قائد" اس کو کہا جاتا ہے جو قوم کو لیکر چلیں، اور ان کی رہنمائی کریں۔ اگر ساری قوم ایک غلط راستے پر جارہی ہے، اور وہ لیڈر جانتا ہے کہ وہ غلط راستے پر جارہی ہے تو وہ ان کو بتائے گا کہ یہ راستہ صحیح نہیں ہے، صحیح راستہ یہ ہے۔ لیکن آج کا قائد اور رہنما عوام کے پیچھے چلتا ہے، جس سے عوام خوش ہو جائے، جس سے اس کو عوام کے ووٹ مل جائیں، لہٰذا بعض اوقات وہ جانتا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، مصلحت کے مطابق نہیں ہے، لیکن چونکہ اس کو عوام کی رضامندی مطلوب ہوتی ہے، اس لئے وہ ویسا ہی کرتا ہے جیسا عوام چاہتے ہیں۔

"صلح حدیبیہ" میں دب کر صلح کیوں کی گئی؟

صلح حدیبیہ کے واقعے کو دیکھئے! صحابہ کرام جوش و خروش کی حالت میں ہیں کہ ہم حق پر ہیں، اور کفار سے مقابلہ کر کے ان کو شکست دے سکتے ہیں تو پھر دب کر صلح

کیوں کی جا رہی ہے، لیکن اللہ کا رسول ڈٹا ہوا ہے کہ اس وقت اللہ کا حکم یہی ہے کہ صلح کرلو، چاہے بظاہر دب کر صلح ہوتی نظر آرہی ہو، تب بھی یہی کرنا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر فرمادیتے کہ چلو، جنگ کرو۔ لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ صلح ہو جائے۔ تمام صحابہ کی باتوں کو آپ نے رد کردیا۔ حضرت فاروق اعظم جیسے انسان تڑپتے پھر رہے ہیں کہ یا اللہ! یہ کیا ہوگیا؟ ہم اتنی دب کر دشمن سے صلح کر رہے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے ہیں، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جاتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ لیکن اللہ کا رسول اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے، کیونکہ اللہ کی وحی کے ذریعہ اس کو یہی حکم ملا ہے۔

خلاصہ

بہرحال! یہ آیت کریمہ یہ سبق دے رہی ہے کہ جب اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم آجائے، یا آپ کا کوئی فیصلہ آجائے تو محض سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے اس کے خلاف شکوک وشبہات کو دل میں جگہ نہ دو، صحیح راستہ وہی ہے جو انہوں نے بتایا، اگر وہ تمہاری ہر بات ماننے لگیں گے تو تم خود پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے، تم خود دکھ اٹھاؤ گے، انجام کار تمہارے لئے نقصان کا سبب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ہمارے دلوں میں ذہن نشین فرمادے کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہی درحقیقت بلند وبالا ہے، چاہے وہ ہماری سمجھ میں آرہا ہو، نہ آرہا ہو، اگر ہمیں یہ بات حاصل ہو جائے تو بے شمار اشکالات اور شبہات اور وسوسے جو دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ سب ختم ہو جائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

حق کی بنیاد پر دوسرے کا ساتھ دو

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد بیت المکرم
گلشن اقبال کراچی

وقت خطاب : بعد نماز عصر تا مغرب

اصلاحی خطبات : جلد نمبر : ۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حق کی بنیاد پر دوسرے کا ساتھ دو

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ، وَ اَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ وَاِنْ طَائِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا ج فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ ج فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ط اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

(سورۃ الحجرات:۹، ۱۰)

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ابھی میں نے آپ حضرات کے سامنے سورۃ حجرات کی دو آیتیں تلاوت کیں، سورۃ حجرات کی تفسیر کا سلسلہ پچھلے چند ماہ سے چل رہا ہے، درمیان میں وقتی مسائل کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا، دو آیتیں میں نے تلاوت کیں، پہلے ان کا ترجمہ عرض کرتا ہوں، اس کے بعد اس کی تھوڑی سی تشریح عرض کروں گا، اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے مطابق بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہو جائے، تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ ان کے درمیان صلح کرائیں۔ یعنی ایسی صورت میں جب مسلمانوں دو گروہ باہم ٹکرا گئے ہوں، اور ان کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی ہو تو پہلا کام جو دوسرے مسلمانوں کے ذمہ ضروری ہوتا ہے، وہ یہ کہ ان دونوں گروہوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرا کر صلح کرائے، اور حتی الامکان ان کو لڑائی سے بچانے کی کوشش کرے، اگر اس طرح کام چل جائے تو بہت اچھا ہے، مقصود حاصل ہے۔

ورنہ مظلوم کا ساتھ دو

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۔ یعنی اگر کہنے سننے سے لڑائی بند نہ ہو، اور صلح کی کوئی صورت نظر نہ آرہی ہو تو پھر اس وقت یہ دیکھو کہ ان میں سے کون مظلوم ہے؟ اور کون ظالم ہے؟ کون زیادتی کر رہا ہے؟ اور کون زیادتی کا شکار ہو رہا ہے؟ اگر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے ایک گروہ زیادتی کر رہا ہے، اور ظلم کا ارتکاب کر رہا ہے تو ایسی صورت میں تمہارا فرض ہے کہ مظلوم کا ساتھ دو، اور ظالم کے خلاف تم بھی قتال کرو، اور اس سے لڑائی کرو۔ یعنی جب صلح کی کوشش کارگر نہ ہو تو ہر مسلمان کا کام

یہ ہے کہ وہ ظالم کا ہاتھ پکڑے، اور مظلوم کا ساتھ دے، اور اس وقت تک ظالم سے لڑتے رہو جب تک وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ کرنہ آجائے۔

نسل یا زبان کی بنیاد پر ساتھ مت دو

یہاں پر دو باتیں احادیث کی روشنی میں سمجھ میں آتی ہیں، ایک یہ کہ قرآن کریم نے سارا دارو مدار اس پر رکھا ہے کہ یہ دیکھو کہ کون برحق ہے، اور کون ناحق ہے، اور کون ظالم ہے، کون مظلوم ہے، اس بنیاد پر کسی کا ساتھ مت دو کہ یہ میرا ہم وطن ہے، یا میرا ہم زبان ہے، یا میری جماعت سے تعلق رکھتا ہے، اس بنیاد پر ساتھ مت دو، بلکہ ساتھ دینا ہو، یا لڑائی کرنی ہو، یہ دونوں اس بنیاد پر ہونے چاہئیں کہ کون ظالم ہے، اور کون مظلوم ہے، زمانہ جاہلیت سے ذہنوں میں جو تصور چلا آتا ہے، اور افسوس یہ ہے کہ وہ آج بھی مسلمانوں کے درمیان موجود ہے، وہ یہ کہ جو شخص میرے قبیلے کا ہے، وہ میرا ہے، جو میری زبان بولتا ہے، وہ میرا ہے، مجھے ہر قیمت پر اس کا ساتھ دینا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ ظالم ہے، یا مظلوم ہے، وہ حق پر ہے، یا ناحق ہے، یہ تصور جاہلیت کا تصور ہے، جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں نے آج اس تصور کو اپنے پاؤں کے نیچے روند دیا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ آج بھی ہماری صفوں یہ صورت حال موجود ہے کہ لوگوں نے اپنی زبان کے اعتبار سے، اپنی نسل کے اعتبار سے، اور اپنے وطن کے اعتبار سے گروہ بنائے ہوئے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہر قیمت پر اس کا ساتھ دینا ہے۔

ایسے معاہدے کی اجازت نہیں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "لَا حِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ" یعنی زمانہ جاہلیت میں مختلف قبائل کے درمیان جو معاہدے ہوتے تھے

کہ ہم ہر قیمت پر تمہارا ساتھ دیں گے، اسلام میں ایسے معاہدوں کی کوئی گنجائش نہیں، ایک مومن کا کام یہ ہے کہ وہ حق اور ناحق کو دیکھے، اور ظالم اور مظلوم کو پہچانے، اگر تم دیکھو کہ مسلمان ظلم کر رہا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس ظلم سے اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرو۔

ظالم کو ظلم سے روکو

ایک طرف تو یہ اصول بیان فرمایا کہ ظالم کا ساتھ مت دو، بلکہ مظلوم کا ساتھ دو، چاہے وہ ظالم تمہارے قبیلے کا ہو، تمہارے وطن کا ہو، تمہاری زبان بولنے والا ہو۔ لیکن یہ اصول بیان کرنے کے بعد ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عجیب جملہ ارشاد فرمایا کہ: اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا: کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، اگر ظالم ہو تب بھی مدد کرو، اگر مظلوم ہو تب بھی مدد کرو۔ صحابہ کرام یہ سن کر بڑے حیران ہوئے، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ مظلوم کی مدد کریں، لیکن ظالم کی مدد کا کیا مطلب ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکو، چونکہ وہ ظلم کرنے کی وجہ سے جہنم کی طرف جا رہا ہے، اپنی آخرت برباد کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ کا غضب اپنے سر لے رہا ہے۔ اب اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکو، اور اس کو یہ بتاؤ کہ تم جس راستے کی طرف جا رہے ہو، یہ ظلم کا راستہ ہے، اور دوزخ کا راستہ ہے، اس سے بچو، اصل مدد یہی ہے کہ انسان کو جہنم میں جانے سے روکا جائے، اللہ کے عذاب اور غضب سے روکا جائے۔

دونوں کے درمیان صلح کرادو

اس آیت کریمہ نے جو اصول بیان فرمایا، وہ یہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ کون ظالم ہے، اور کون مظلوم ہے، اور اگر ظالم اپنے ظلم سے باز نہیں آتا تو تمہارا فرض ہے

کہ اس سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ آگے فرمایا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، یعنی تمہاری بات مان کر ظلم چھوڑ دے تو اس صورت میں ان دونوں فریقوں کے درمیان صلح کراؤ۔ جب ظالم نے ہتھیار تو ڈال دیے اور ظلم سے تو باز آگیا، لیکن دونوں فریقوں کے دلوں میں ابھی تک کدورت باقی ہے، اس کدورت کو دور کرنے کے لئے انصاف کے ساتھ ان کے درمیان مصالحت کرا دو۔ اس لئے کہ جب دو فریقوں میں لڑائی ہوتی ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہو جاتے ہیں تو اگرچہ مجموعی طور پر ایک گروہ برحق ہوتا ہے، اور دوسرا ناحق ہوتا ہے، لیکن لڑائی کے وقت دونوں کی طرف سے کچھ نہ کچھ زیادتیاں ہو جاتی ہیں، اس لئے کہ مثل مشہور ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، جو شخص مظلوم ہے اس کی طرف سے بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہوئی ہوگی، جس کی وجہ سے لڑائی تک نوبت پہنچ گئی، لہٰذا جب ظالم اپنے ظلم سے باز آگیا تو اب ہر ایک فریق کو انصاف کے ساتھ اس کی غلطی بتانے کی کوشش کرو کہ تمہارا یہ موقف درست تھا، لیکن فلاں بات غلط تھی، آئندہ کے لئے فلاں بات سے پرہیز کرنا، اس لئے آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صلح کرانے میں انصاف کے سے کام لو، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ یہ اصول تو پہلی آیت میں بیان فرما دیا۔

اسلامی اخوت کی بنیاد ایمان ہے

اس کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس سے بڑا اصول بیان فرمایا کہ:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ

سارے مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں، جو شخص بھی اللہ پر اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہے، اللہ کی کتابوں پر، اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا

ہے، وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کے ذریعے یہ اصول بتا دیا کہ اسلام میں جو اخوت اور بھائی چارہ ہے، وہ درحقیقت ایمان اور عقیدے کی بنیاد پر ہے، رنگ، نسل، وطن، قبیلے اور برادری کی بنیاد پر نہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوتیں اور فخر وغرور کے سامان سب ختم کر دیئے" اور فرمایا کہ:

لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِاَبْيَضَ عَلٰى اَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى

کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت نہیں ہے، نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فوقیت حاصل ہے، اگر کسی کو فضیلت ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ جو زیادہ متقی ہے، وہ افضل ہے، چاہے وہ ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتا ہو، اور جو متقی نہیں ہے، وہ دوسروں کے مقابلے میں کمتر ہے، چاہے بظاہر دیکھنے میں اس کی شان وشوکت زیادہ نظر آتی ہو۔ یہ اصول بیان فرما دیا۔

مسلمان کو بے یار و مددگار مت چھوڑو

جب یہ اصول بیان فرما دیا کہ سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں، تو اس اصول کا نتیجہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ:

اِنَّ الْمُسْلِمَ اَخُو الْمُسْلِمِ ، لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يُسْلِمُهٗ

یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، لہٰذا ایک مسلمان نہ تو دوسرے مسلمان بھائی پر ظلم کرے گا، اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑے گا، یعنی اگر اس پر ظلم اور زیادتی ہو رہی ہوگی تو مسلمان کا یہ کام نہیں کہ وہ اس کو ظالم کے رحم وکرم پر چھوڑ دے، بلکہ تمہارا فرض ہے کہ اس کا ساتھ دو، اس کی مدد کرو۔ یہ محض اخلاقی ہدایت نہیں، بلکہ تمہارا دینی فریضہ ہے کہ جب تک تمہاری استطاعت میں ہے، اس کو ظلم سے بچاؤ۔

دولت مند معاشرے کا حال

آج ہمارے معاشرے میں یہ منظر نظر آتا ہے کہ جو غریب قسم کے لوگ ہیں، وہ تو ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن دولت مند معاشرے میں یہ منظر نظر آتا ہے کہ کسی کو اس کی پرواہ ہی نہیں ہے کہ میرے پڑوسی کا کیا حال بن رہا ہے، اس کے اوپر کیا گزر رہی ہے، بلکہ ہر شخص اپنے حال میں مگن ہے۔ ایک مرتبہ میں نے خود یہ منظر دیکھا کہ ایک کار نے ایک آدمی کو ٹکر ماردی، وہ شخص سڑک پر گر گیا، اور وہ کار والا مارتا ہوا نکل گیا، اس کار والے نے یہ نہیں سوچا کہ یہ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کو کچھ طبی امداد پہنچاؤں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ ایک مؤمن کا یہ کام نہیں کہ وہ دوسرے مؤمن کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اس طرح چلا جائے، بلکہ جہاں موقع ہو، اور جتنی استطاعت ہو، وہ دوسرے مؤمن کی مدد کرے، بہر حال! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' یعنی سارے مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں، چاہے وہ تمہاری زبان نہ بولتا ہو، چاہے وہ تمہاری نسل سے تعلق نہ رکھتا ہو، لیکن اگر وہ مؤمن ہے تو تمہارا بھائی ہے۔

کلمہ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کا رشتہ

اللہ تعالیٰ نے یہ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کا رشتہ ایسا مضبوط بنایا ہے کہ یہ کسی زبان کا محتاج نہیں۔ مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولتا کہ آج سے تقریباً ۱۵-۲۰ سال پہلے میرا چین جانا ہوا، اور اس زمانے میں چین کے اندر باہر کے لوگوں کے آنے کا سلسلہ نیا نیا شروع ہوا تھا، اب بھی وہاں بہت بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ مسلمانوں کے ایک علاقے میں میرا جانے کا اتفاق ہوا، اس وقت وہاں برف باری ہو رہی تھی، اور درجہ حرارت منفی ۱۶ ڈگری تھا، فجر کے وقت ہمیں ایک علاقے سے گزرنا تھا، جہاں مسلمانوں کی آبادی تھی، اس علاقے کے مسلمانوں کے یہ اطلاع ملی تھی کہ پاکستان

کے مسلمانوں کا ایک وفد آ رہا ہے، چنانچہ وہ لوگ کئی گھنٹے پہلے سے پہاڑی کے درمیان برف باری کے اندر صرف باہر کے مسلمانوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے، جب ہمارا قافلہ ان کے قریب سے گزرا تو ان کی زبان پر صرف ایک نعرہ تھا ''السلام علیکم'' اور سلام کرتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اس لئے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے اپنے وطن سے باہر کے کسی مسلمان کی شکل دیکھی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ ہم ان کی زبان جانتے ہیں، نہ ان سے بات کر سکتے ہیں، نہ یہ ہماری بات سمجھیں گے، اور نہ ہم ان کی بات سمجھیں گے، خاندانی اعتبار سے، نسلی اعتبار سے، زبان کے اعتبار سے ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا، لیکن دل میں محبت کے دریا صرف اس لئے موجزن تھے کہ ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' پڑھنے والے تھے، ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' کا منظر اللہ تعالیٰ نے وہاں دکھا دیا۔

قرآنی تعلیمات سے دوری کا نتیجہ

اگر دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ ہر مسلمان ہمارا بھائی ہے تو نہ جانے کتنے جھگڑے، کتنے فساد، کتنے قتل و قتال ختم ہو جائیں، افسوس یہ ہے کہ آج یہ سبق ہم لوگ بھولتے جا رہے ہیں، آج مسلمان مسلمان کا گلا کاٹ رہا ہے، آج مسلمان مسلمان کے خلاف صف آرا ہے، آج مسلمان مسلمان کو قتل کرنے کی فکر میں ہے، مذہب کے نام پر، دین کے نام پر، عبادت کے نام پر یہ سب کام ہو رہے ہیں، عبادت گاہیں تک محفوظ نہیں رہیں، ان پر بھی حملے کیے جا رہے ہیں، یہ سارا فساد اس بات کا ہے کہ آج ہم قرآن کریم کی تعلیمات سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

مسلمان کو قتل کرنے کی سزا

آج ہم نے معمول کی چند عبادات کا نام دین رکھ لیا ہے، لیکن دین کی وسیع تعلیمات جو قرآن کریم ہمیں بتلا رہا ہے، ان سے نہ صرف ہم غافل ہیں، بلکہ ان کو

دین کا حصہ سمجھنے کے لئے بھی تیار نہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ:

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا (النساء:۹۳)

یعنی جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے، اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ:۳۲)

یعنی اگر کوئی شخص کسی ایک آدمی کو قتل کردے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، یا اس نے زمین میں فساد پھیلایا ہو، تو وہ شخص ایسا ہے جیسے اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا۔ جس دین میں ایسی ہدایات موجود ہیں، اس دین کے نام لیوا، اور اس دین کے پیروکار ایک دوسرے کے قتل و قتال میں ملوث ہوں، یہ اتنا بڑا وبال ہے جو ہمارے اوپر مسلط ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اس وقت کسی کا ساتھ مت دو

ایک آخری بات اسی سلسلے میں یہ عرض کرنی ہے کہ ان آیات کریمہ میں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ ظالم کا ساتھ نہ دو، بلکہ مظلوم کا ساتھ دو۔ یہ حکم اس وقت ہے جبکہ واضح طور پر پتہ چل جائے کہ یہ شخص حق پر ہے، دوسرا ناحق ہے، اس وقت تو فرض بنتا ہے کہ حق والے کا ساتھ دیا جائے، لیکن بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جہاں حق واضح نہیں ہوتا، مثلاً دو گروہ آپس میں لڑ رہے ہیں، اور یہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ کون حق پر ہے، اور کون باطل پر ہے، ایسی صورت کے بارے میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ایک وقت ایسا آئے گا کہ دو فریق آپس میں لڑ رہے ہوں گے، اور دونوں مسلمان کہلائیں گے، اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ کون حق پر ہے، اور کون باطل پر

ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ اندھے جھنڈے کے تحت لڑ رہے ہوں گے، ایسے وقت کے لئے آپ نے یہ ہدایت دی کہ "فاعتزل هذه الفرق کلها" تم اس وقت ان سب سے کنارہ کشی اختیار کرلو، اور کسی کا ساتھ نہ دو، نہ کسی کی حمایت کرو، نہ کسی کی مخالفت کرو، بس خاموش ہو کر اپنے کام سے کام رکھو۔ اس لئے کہ اگر تم کسی کا ساتھ دو گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی مظلوم پر تمہاری طرف ظلم ہو جائے۔ بہر حال! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی صورت میں علیحدہ رہنے کا حکم دیا ہے، اور ایسی صورت کو "فتنہ" سے تعبیر کیا ہے۔

فتنہ کے وقت اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ

"فتنہ" اسی کا نام ہے کہ انسان پر حق واضح نہ ہو، یہ پتہ نہ ہو کہ کون حق پر ہے اور کون باطل ہے۔ اگر حق واضح ہو جائے تو وہ فتنہ نہیں، لیکن اگر حق واضح نہیں ہو رہا ہے تو وہ "فتنہ" ہے، اور فتنہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ رہنے کا حکم دیا ہے، بلکہ یہاں تک آپ نے فرمایا کہ "اپنے گھر میں چپ چاپ بیٹھ جاؤ، اور باہر نکل کر لڑنے والے گروہوں کو دیکھو تک نہیں" اس لئے کہ فتنہ ایسی چیز ہے کہ اگر تم اس کی طرف دیکھو گے تو وہ فتنہ تمہیں اُچک لے گا، اس لئے اس سے دور رہو، ہمارے یہاں بہت سی لڑائیاں، بہت سے جھگڑے، خاص طور پر سیاسی نوعیت کے جھگڑے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں عام طور پر یہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہی ہے کہ آدمی اس سے کنارہ کش رہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو ان احکام اور تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

جلد گیارہوں (۱۱)

جلد بارہویں (۱۲)

جلد ۱۳

جلد ۱۴

جلد ۱۵